دانہ و دام

از

راجندر سنگھ بیدی

ناشران

مکتبۂ اردو لاہور

فہرست

بار اول   تعداد ایک ہزار   قیمت عہ

چودھری نذیر احمد صاحب پرنٹر پبلشر مکتبہ اردو ۱۵ اسرکلر روڈ نے مرکنٹائل پریس لاہور سے چھپوا کر شائع کیا

انتساب

اپنے مرحوم ماں باپ کے نام

"دل خوش نہ شود پر از غم را
ہجرِ تو حزیں کرد دلِ خرّم را
من تلخیٔ عالم بتو خوش می کردم
بہ تلخیٔ ہجرت چہ کنم عالَم را"

راجندر سنگھ بیدی
رتن نگر۔ لاہور
دسمبر ۱۹۳۹

دیباچہ

شوپنہار لکھتا ہے "بہت سی کتابیں بری ہیں۔ اور وہ مطلق لکھی ہی نہیں جانی چاہیئے تھیں"
ہم ایک مسلم تنوطیت پسند کے اس دعوے کو جھٹلانے کی کتنی ہی کوشش کریں ہمیں یہ تسلیم کرنا ہی ہوگا کہ بہت سی کتابیں جو کہ مطبعوں سے معرض وجود میں آتی ہیں۔ ان میں سے بہت کم ایسی ہیں جنھیں فضیلت کے بلند ترین معیار پر رکھ سکیں اور اس کے وجوہ ڈھونڈنا چنداں مشکل نہیں یہ اس لئے نہیں کہ مصنف کا فن غیر معمولی طور پر مشکل العمل ہے۔ بلکہ اسے نہایت آسان فرض کر لیا گیا ہے۔ اور بغیر فن کی ابتدائی تعلیم واقف کاری سے اس کی بسم اللہ کی جاتی ہے۔ بدقسمتی سے ہر قسم کے فن کے لئے محض اوزار کی ضرورت نہیں۔ از بسکہ لکھنے کیلئے قلم دوات اور کاغذ کی ضرورت ہے۔ یقیناً ہر ایک ہنرمند کو کام میں ایک خاص شغف اور مہارت کی ضرورت ہوتی ہے لیکن مصنف کو اس سے بھی کہیں زیادہ، ایک بلند مرتبہ چیز کی تلاش ہے۔ اس کے اوزار محض اوزار نہیں ہوتے جن سے ایک خاص قسم کی مقصد براری ہوتی ہے۔ نہ ہی وہ مہارت ہوتی ہے جسے وہ قدرتِ اظہار کے نام سے موسوم کر دے ... ... بھلا بتایئے تو، اگر مصنف کے پاس کہنے کے لئے ہی کچھ نہ ہو، تو اس کے ساتھ کیا گذرے پس اولین چیز مصنف کے نزدیک یہ ہے کہ اسے کچھ لکھنا ہو۔ اور اس میں آمد ہو

(قلبی نظام کار کے نہایت زیرکانہ تجزیہ کے باوجود ہم یہ کہیں گے جیسا کہ ڈناہ نے کہا ہے کہ ہمارا بلند تخیل ... ہمیں عطا کیا جاتا ہے۔"

"جارج ایلیٹ"

مصنف اس خاص قسم کے عطیہ کے حصول کیلئے دوسرا لقمہ بھی منہ میں نہیں رکھتا۔ ایک سینما فلم کو بغیر پورے طور پر دیکھے ہوئے گھر واپس لوٹ آتا ہے۔ اور کبھی کبھار شدت کی برودت میں اپنے نرم و گرم بستر میں سے اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ اور اپنے اس عجیب و غریب ملاقاتی INSPIRATION سے ایک نہایت پرتپاک مصافحہ کرتے ہوئے اس کے ایماء پر لکھنا شروع کر دیتا ہے۔ اسوقت اسے دولت و ثروت، شادی و غمی کسی چیز کا خیال نہیں ہوتا۔ وہ صرف اس بات کی کوشش کرتا ہے۔ کہ اس کی پرواز تخیل کے ساتھ ساتھ دوڑ سکے۔ کیونکہ اڑنے اور دوڑنے میں فرق ہے۔ اگرچہ یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ مصنف کی طاقتیں کبھی خاموش (STATE OF COMA) ہو جاتی ہیں۔ اور کافی سر دھننے کے بعد اسے اس بات کا علم ہوتا ہے کہ وہ طاقتیں بھی حدود رکھتی ہیں۔ اور انھیں حدود میں ردّ و بدل ہوتا ہے۔ اس عرصہ کے دوران میں کسی دن اس امر کا انکشاف ہو جاتا ہے کہ وہ قوتیں جنھیں وہ خود بیدار کرنے کیلئے سر دھنتا تھا۔ وہ چند ایک خارجی اسباب و علل کی وجہ سے حرکت میں آ گئی ہیں۔ اور ایک خاص کتاب، گفتگو یا نگاہ نے اس خوابیدہ فتنے کو جگا دیا ہے۔

سعادت حسن منٹو نے 'من کی من میں' اور 'گرم کوٹ' پر تبصرہ کرتے ہوئے اسی بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ بیدی صاحب جو لکھتے ہیں۔ انھیں لکھنا ہوتا ہے۔ اور جس طرح ٹھیٹ روسی ادب کا آغاز گوگول کے افسانے 'لبادہ' سے ہوا تھا۔ اسی طرح ہندوستان کے ٹھیٹ افسانوی ادب کا آغاز راجندر سنگھ بیدی کے افسانہ گرم کوٹ سے ہوگا۔ مجھے بھی ان کے افسانے 'گرم کوٹ' پڑھنے کے بعد اسی شدت کی آمد نے بہت متاثر کیا۔ تخیل کی پختہ کاری کس طرح ایک غریب کلرک کو مصیبت میں ڈالے رکھتی ہے۔ اور وہ تخیل کی پختہ کاری کیا ہے 'شمی' کی دو چمکتی ہوئی آنکھیں اور اس کا کافوری سفید کوٹ جن سے کہ وہ والہانہ محبت کرتا ہے! اسی میں مجبوری اور محبت کی کشمکش کو کچھ اس لطیف پیرائے میں پیش کیا ہے کہ بے اختیار داد دینے کو

جی چاہتا ہے۔ اور پھر وہ مبہم سے کلمے ــــ

"وہ شمی کا ھنسنا اور میرا پھٹا ہوا کوٹ!"

اور جب ہیرو کے گرم کوٹ خریدنے کی بات ہو رہی ہے، تو اس کی بیٹی پشپا ناچتی گاتی ہوئی آ جاتی ہے۔ اور کہتی ہے، مجھے استانی نے گرم بلیزر ایک گز مربع ڈی ایم سی کے گولے گنیا ماپ کے لئے اور دو سوتی لانے کیلئے کہا ہے۔ اس وقت شمی سوائے اپنے شوہر کے گرم کوٹ کے کسی اور بات کو سننا نہیں چاہتی۔ وہ اپنی بیٹی کو ایک چپت لگاتی ہے۔ ہیرو اپنی بیٹی کو بھی محبت کرتا ہے اسی وقت ایک فقرہ اضطراری لے میں ڈوبا ہوا آتا ہے۔

"وہ پشپا منی کا رونا، اور میرا نیا کوٹ!"

اور ان دو مبہم سے فقروں کی تکرار سے ایک دنیا کی تخلیق ہو گئی ہے۔ اسی طرح بھولا بھی بیدی صاحب کی ایک ہمیشہ قائم رہنے والی کہانی ہے۔ اس کی نشو و نما دیہات کی سادہ معاشرت میں ہوئی۔ بخلاف اس کے 'پان شاپ' 'گرم کوٹ' 'ہمدوش' اور 'کوارنٹین' وغیرہ کی شہر کی فضا ہیں۔ لیکن یہ سب کہانیاں اپنی اپنی جگہ پر ایک قابل فن کار کے نقوش قلم ہیں، صنعت نہ دیہات کا ٹھیکہ ہے اور نہ شہر کی اجارہ داری۔ دیکھنا تو یہ ہے کہ کس بلا کی آمد کے ساتھ لکھے گئے ہیں۔ اور مصنف نے نفس تحت الشعور کی کتنی کامیاب تصویر پیش کی ہے۔

عالمگیر صداقت:۔ مصنف وہ انسان ہے جس پر کسی چیز کی صداقت عیاں ہوئی اور اس نے اس صداقت کو جس حد تک دوسروں تک پہنچا دیا، اسی درجہ وہ کامیاب گنا جاتا ہے، بالفاظِ دیگر مصنف ایک حقیقت نگار ہے۔ اب یہ حقیقت نگاری اتنی آسان چیز نہیں جتنا کہ متصور کیا گیا ہے۔ اولین مراحل میں تو حقیقت کو پانا ایک آسان امر نہیں۔ اور پھر حقیقت کو دوسروں تک پہنچانا کہیں زیادہ مشکل ہے۔ لیکن ہر وہ انسان جو عادتاً اس قسم کی مشکلات پر حاوی ہو جاتا ہے

وہ اس صداقت کی قیمت سے واقف ہوتا ہے۔ جو کہ روح میں لطافت پیدا کرتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں مصنف نہ صرف ایک حقیقت نگار ہی ہوتا ہے۔ بلکہ حقیقت پسند بھی۔
ہم یہ سوچنے کے عادی ہو چکے ہیں کہ افسانہ بوجہ اپنے اصلاحی مطلب کے ایک صداقت کے مخالف چیز ہے، لیکن معمولی سی مثال اس بات کی مظہر ہوگی، کہ افسانہ نگار کو بھی صداقت سے اتنا ہی واسطہ ہے جتنا کہ تاریخ داں کو واقعات سے۔ لیکن اس کے لئے طریقہ اور ہے۔ پہلے ہم افسانے کی تعریف "زندگی کی ایک رمق کی تصویر" متصور کر لیں۔ پھر بک لخت ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ وہ تصویر سچی ہے یا جھوٹی۔ وہ اپنے موضوع کی صحیح نمائندگی یا وضاحت کرتی ہے یا نہیں کرتی؟ کیا صرف ایک کیری کیچر تو بن کے نہیں رہ جاتا؟ ایک تخیل پرست مصور بھی اپنی تصاویر میں جزئیات کو قدرت کی سی صداقت میں سے اخذ کرتا ہے۔ پس ایک ہنر مند افسانہ نگار کیوں ایسا نہ کرے گا۔ کیونکہ دونوں کے لئے ایک ہی غیر ممکن الفسخ قانون ہے، اور وہ یہ کہ حتیٰ الامکان قیاس آرائی سے گریز کریں اور اپنی صنعت کو قدرت اور حقیقت کے نزدیک تر رکھیں۔ میں ایک اور مثال سے اس بات کی وضاحت کرتا ہوں۔ فرض کر لیجئے کہ ہمارے افسانے یا ناول کے پلاٹ کیلئے ضروری ہے کہ ایک کردار عنفوان شباب سے کچھ عرصہ پہلے اندھا ہو جائے۔ اب ایک ہنر مند کردار نگار اس شخص کی بقیہ زندگی کو محض تخیل کی مدد سے نہیں لکھے گا۔ ایک اندھے کی تمام حرکات اس شخص کے لئے جسے اندھے کو قریب تر رہ کر دیکھنے کا موقع ملا ہو۔ ایک محیر العقول طاقتوں کا سرچشمہ ہیں۔ لیکن افسانہ نگار کو بحیثیت حقیقت نگار کے یہ دیکھنا ہوگا۔ کہ وہ کب اندھا ہوا۔ اندھے ہونے سے پہلے وہ دنیا میں سے کیا کیا کچھ جذب کر سکا۔ اس میں جنسی بیداری کس قسم کی شکل اختیار کرے گی، اور وہ ان نقوش کے مطابق جو کہ بچپن میں اس کے پردہ ذہن پر منقش ہو چکے ہیں، عمل پیرا ہوگا۔ اور وہ مصنف جو بالکل نا مطابق واقعات سے اپنے صفحات کو بھرنا نہیں چاہتا۔ اپنے آپ کو ان حدود کے اندر رکھے گا۔ حقیقت کے نقطۂ نگاہ

سے بیدی کے تمام افسانے جیتی جاگتی تصویریں ہیں۔ ان کے کردار وہی کہتے ہیں۔ جو انہیں اس حالت میں کہنا چاہئے۔ وہ حرکتیں بھی ویسی ہی کرتے ہیں۔ سٹیونسن لکھتا ہے " میرے افسانے حقیقت نہیں ہیں۔ میرے کردار وہی کرتے ہیں جن افعال کے وہ زندگی میں مرتکب ہوتے ہیں۔ حقیقت کے لئے زیادہ سے زیادہ جزئیات کا مطالعہ کم نہیں " اور اس قسم کی جزئیات نگاری کے اچھے نمونے 'پان شاپ' " دس منٹ بارش میں' اور خیاتین 'دب' میں ملتے ہیں۔

حقیقت اور جزئیات نگاری کا یہ مطلب نہیں۔ کہ کوئی واقعہ لے کر اسے نوع بہ نوع تمامتر جزئیات کے ساتھ لکھ کر ایک فہرس CATALOGUE بنا دی جائے۔ بلکہ اس میں قلب و ذہن کے تاثرات اور فکر کی حکمت بھی پائی جائے۔ میرے قیاس میں اگر سوائے عام ترقی پسند ادب اور وقائع نگاری کا صحیح مفہوم ... ... کوئی مصنف سمجھا ہے۔ تو وہ بیدی ہے وہ افلاس و فلاکت اور عریاں نگاری کو ہی ترقی پسند ادب نہیں کہتا۔ اس کے لئے مزدور، بھکارن، چھوٹے طبقہ کے لوگوں کی زندگی SLUM LIFE ہی نقطہ مرکزیہ (PIVOT) نہیں جسکے گرداگرد وہ گھومتا رہے۔ وہ ہمیشہ تاریک پہلو ہی نہیں دیکھتا۔ جہاں وہ گرم کوٹ، گوارتن، اور خیاتین 'دب' میں چھ پائی روزانہ آمدنی والے ہندوستانی کو ہمدرد نگاہوں سے دیکھتا ہے وہاں وہ ہندوستان کو رسوم و رواج RITUALS & PAGEANTRY اور روح کے اعتبار سے امیر اور بلند پایا ہے ' من کی من میں، کہانی میں " اوٹی بھرن " چھوکری کی لوٹیں " لوٹ " کی رسم، اور تلادان میں سیتلا ماتا کی مورتی کا جلوس اس صناعی کے نہ بھولنے والے نمونے ہیں۔ لکھنا وہ عمومی بورژوائی طبقہ کے متعلق ہے۔ لیکن اسطرح کہ تصویر کے دونوں پہلو سامنے رکھتا ہے۔ اگر ترقی پسند مفہوم کا ادب پسماندہ طبقے کی تصویر اور وقائع نگاری کا مطلب یک لڑکی اور ایک لڑکے اور پھر رومان کو پیش کرنا ہی ہے، تو یہی کیا تھوڑا ہے کہ وہ راجوں مہاراجوں کے قصے اور محبت کی وہ فرضی

کہانیاں جو پیٹ بھرنے کے بعد سوجھتی ہیں انھیں وہ بالکل چھوڑ دیتا ہے۔ اس کا مقصد نہ صرف زندگی کی ایک سانس لیتی ہوئی تصویر کھینچنا ہے۔ بلکہ قطع نظر فہرس سازی اور فوٹو گرافی کے اس کا مقصد آفرینش اور تخلیق ہے۔ اور بیدی فن برائے فن کا مطلق قائل نہیں۔

بیدی اِس درجہ حساس ہے کہ عشق و محبت کی داستانیں ہمارے سامنے پیش کرتے ہوئے وہ ایک رومانی وقائع نگار بھی بننا نہیں چاہتا۔ کیونکہ اس قسم کے قصے اتنے لکھے گئے ہیں کہ اگر اس کے سے حساس انسان میں اس کا ردِ عمل پیدا ہوا ہے تو یہ عین قدرتی بات ہے اس کے افسانہ میں عورت کے رخسار کبھی بھی کسی متقابل جنس کے شانہ کو نہیں چھوتے۔ بلکہ ،دوشیزہ، کی قسم کی عورت ماسوائے ،چھوکری کی لوٹ، کے اس کے سب افسانوں سے حیرت انگیز طور پر مفقود ہے۔ حق تو یہ ہے کہ عورت محض عشق جتانے یا مرد کی ہوس پرستی کے آلہ کار کے علاوہ ماں، بہن بھی ہے۔ گرم کوٹ میں وہ عورت کو بیوی کی صورت میں دیکھتا ہے تو پھر اس میں وہاں اسی حد تک قائم ہے، جس حد تک کہ بیوی کے ساتھ رومان (!) قائم رہ سکتا ہے۔ وہاں بھی ایک پاکیزہ سی محبت کی تخلیق ہو جاتی ہے۔ بہت سے افسانوں مثلاً ہمدوش، ردِ عمل، کوارنٹین وغیرہ میں عورت تصویر کو مکمل کرنے کے لئے آتی ہے۔ میں سوچتا ہوں کہ گرم کوٹ کے سے افسانے میں بیوی کی جگہ دوشیزہ کی قسم کی عورت ہوتی، تو تصویر کتنی بودی ہو جاتی۔ رومان انسانی قلب کے قریب تر ہونیکی وجہ سے زیادہ ابھر کر کشاکش حیات کی جیتی جاگتی تصویر کو آناً فاناً مٹا دیتا۔ بھولا میں ایک عورت بیک وقت ماں، بہن اور بہو کی صورت میں نمودار ہوتی ہے۔ اور وہ عالم پیدا ہوتا ہے جو اچھے سے اچھے رومان میں بھی پیدا نہیں ہو سکتا۔ وہ عورت ایک ہی وقت میں بچے کو ہری ہرا سنونتر سناتی، اپنے سسر کی جوتی کو سرسوں کا تیل لگاتی اور اپنے بھائی کے لئے پیار کے جذبہ میں معمور ہر روز آدھ پاؤ مکھن جمع کرتی ہے۔ بھولا اور گرم کوٹ میں گھریلو فضا کی

تصویر اس حد تک کامیاب ہے کہ میں نے شاید ہی اردو کے کسی افسانے میں دیکھی ہوگی۔

طباعی:۔ شوپنہار نے 'صنف ادب' اور ایمرسن نے 'حوالہ اور طباعی' میں مذکورہ عنوان پر کچھ لکھا ہے۔ لیکن ان دونوں مصنفوں میں سے کسی نے بھی اس طاقت کا جس کے کہ وہ خود مظہر ملکہ استاد تھے تجزیہ نہیں کیا۔ البتہ کارلائل نے اپنے مضمون 'بطل پرستی' میں ایک سے زیادہ جگہ پر اس عظیم الشان طاقت کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اور ہمیں ان اشاروں سے شوپنہار اور ایمرسن کے طویل مضامین کی نسبت زیادہ پتہ چلتا ہے۔ بات یوں ہے، طباعی کا مضمون تجزیہ کا شرمندہ نہیں۔ اور اگر ہم کسی حد تک ان اوصاف کو جن سے طباع متصف ہوتا ہے ایک ایک کر کے صفحہ قرطاس پر لانے کے لئے تیار بھی ہو جائیں، تو ہم کو پتہ چلے گا، کہ حرف مطلب تو ادا ہی نہیں ہوا۔ نوجوان مصنفین میں یہی ایک امتیازی قوت ہے، اگرچہ کچھ حد تک وہ خود اس کا مطلب نہیں سمجھتے۔ لیکن جب ہم کسی طباع سے ملتے ہیں، بالفاظ دیگر اس کی تحریر کو دیکھتے ہیں، تو وہ فوراً ہمیں عامیوں سے الگ دکھائی دیتا ہے۔ اس کے خیالات میں اتنی ندرت اور زندگی ہوتی ہے، کہ ہمیں دوسروں میں دکھائی نہیں دیتی ہم اس کی افضلیت کو دیکھتے ہیں لیکن بیان نہیں کر سکتے۔ کیونکہ عام انسان اور طباع میں یہ فرق ہے کہ وہ اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے۔ اور عام انسان اس کی آنکھوں سے دیکھتے ہیں، وہ اپنے لئے سوچتا ہے۔ وہ اپنے مضمون کو پکڑ لیتا ہے۔ اسے اچھی طرح سے گھورتا ہے۔ اور نہیں جانتا کہ فلاں مصنف کی اس کے متعلق کیا رائے ہے۔ یہ اس کا کام نہیں۔ وہ خود نفس مضمون کی گہرائیوں تک اتر جاتا ہے اور اپنے مشاہدات بیان کرتا ہے۔ چونکہ اس کے اندر حقیقت ہے، اس لئے وہ باہر بھی حقیقت کا مطالبہ کرتا ہے۔ اور جب وہ ہمیں اپنے تمام خلوص SINCERITY صدق و صفا کے ساتھ دکھائی دیتا ہے، تو ہم اسے شاعر، پیغمبر اور نہ جانے کیا کیا کچھ کہہ جاتے ہیں۔ روس میں گورکی کی تمثیل و اصنام کی حد تک پرستش اسی جذبہ کی مظہر ہے

طباعی اور فارملزم:۔ طباعی کی سب سے بڑا دشمن فارملزم FORMALISM ہے۔ یعنی رسوم و قیود۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ صاحب طباع انسان کو دوسری باریک بیں ... آنکھ میں سے دیکھنے کی بھی عادت نہیں ہوتی۔ وہ اپنے لئے خود سوچتا ہے۔ لیکن ہم رسوم و قیود احادیث وغیرہ میں اتنے جکڑے ہوتے ہیں کہ آسانی سے ان سے چھٹکارا پانا تو ایک طرف ان کے خلاف سننا بھی گوارا نہیں کرتے۔ بعض رسوم تو ایسی ہوتی ہیں۔ جو کہ وقتی اور مقامی طور پر اچھی ہوتی ہیں۔ کسی زمانہ میں ان کا فائدہ ہوتا ہوگا۔ لیکن وہ اپنے معرض وجود میں آنے کی وجہ کے فوت ہو جانیکے بعد بھی بہت عرصہ تک زندہ رہتی ہیں۔ اور جب معاملات نہایت پیچیدہ ہو جاتے ہیں تو ان کا تجزیہ کرنے والا بھی پیدا ہو جاتا ہے۔ لیکن فارملزم کو اشارتاً چھیڑنا بھی سماج برداشت نہیں کرتی۔ آخر شیلے اور ہاگ کو "دہریاپن کی ضرورت" کا پمفلٹ لکھنے کے فوراً بعد ہی آکسفورڈ کے دارالعلوم سے کیوں خارج کر دیا گیا تھا۔ یہ بغاوت کا ایک چھوٹا سا جذبہ ہوتا ہے جو ہر ایک طباع میں موجود ہوتا ہے۔ بھولا میں بابا بچے سے پوچھتا ہے۔ "تیرے ماموں جی تیری ماتا جی کے کیا ہوتے ہیں؟" تو وہ سادگی سے جواب دیتا ہے "ماموں جی"۔ بچہ قدرت کے بیشتر نزدیک ہوتا ہے۔ اس لئے وہ دنیا کے ان رشتوں کو نہیں سمجھتا۔ یہ ایک بغاوت ہے۔ لیکن نہایت ہی چھوٹے پیمانہ پر۔ یہ چھوٹا سا ظلم چھوکری کی لوٹ میں کچھ بلند ہو جاتا ہے۔ پرسادی کی ماں بیوہ ہے لیکن پرسادی پوچھتا ہے۔ "چندو کے گھر منا ہوتا ہے۔ بیرو کے گھر بھی منا ہوا ہے ماں ... ہمارے گھر کیوں نہیں ہوتا منا"۔ ماں جواب دیتی ہے "تمہارے پتا لایا کرتے تھے منا۔ وہ اب روٹھ گئے ہیں"۔ لیکن بچے کی آزاد فطرت کی اس سے تسلی نہیں ہوتی۔ چونکہ اس کے لئے تایا باپ کی جگہ ہے وہ کہتا ہے "تو تایا کو کہئے نا ... وہی لادیں ہمارے گھر منا"۔ اسی افسانے میں آگے چل کر بچہ تو SYMBOL سا بن جاتا ہے۔ اور مصنف داخل ہو کر شادی کی

کی انسٹی ٹیوشن پر ایک بڑی طنز کر جاتا ہے۔

"کیوں نہیں ملو کنھیا رتنی کو لے جاتے ... ... پر تمانے آپ ہی تو میل ملایا تھا.....
پرماتما کے کئے میں دخل دیتے ہیں نا ... ... اور لا دیتے ہیں اتنا مردہ سا کالا
کلوٹا بچا"

بیدی کے نزدیک بھی عورت اور مرد کا ملاپ ایک حیاتیاتی مقصد کے لئے ہے یوں
ظاہر ہوتا ہے جیسے وہ شادی کی بندش نہیں چاہتا۔ دیکھئے یہ طباع کے لئے کیسی خطرناک
سرزمین ہے۔ یہ چھوٹا سا عالم تلادان میں ایک غضب ناک بغاوت کی صورت اختیار کر لیتا ہے
وہاں بچہ پھر ایک SYMBOL ہے۔ کیونکہ بیدی حقیقت کا پرستار ہے۔ اور بچے سے زیادہ
حقیقت کے نزدیک کوئی نہیں۔ اس کا دل لاگ لپیٹ نہیں جانتا۔ اور وہ بچہ نہیں سمجھتا
کہ امیروں کے بیٹوں کا تلادان ہوتا ہے تو اس کا کیوں نہیں ہوتا۔ جس حالت میں بچے کا
تلادان ہوتا ہے۔ اور جس حالت میں حیاتین ب ، میں من بھری تشنگی ہوتی ہے۔ پڑھ
کر خون کے آنسو ابل آتے ہیں۔ دھوبی کے بچے اور مانا دین کی بیوی کی شکست پندار ایک
ماتم ہے۔ اور پان شاپ میں بین الاقوامی کاروبار کا شائق تھارو لال جب دیکھتا ہے کہ اس
کا کام چیڑ و گراڈ ٹمبکٹو اور ہونولولو تک وسیع ہونا تو ایک طرف رہا۔ وہ تو نشیبی چوک چھاؤنی
کے ہائی سکول اور بیگم بازار کے نواحی تین محلوں سے باہر جانے سے بھی قاصر رہا۔ اور قریب ہی ہے
کہ بیگم بازار کی منحوس دوکان اپنی کہاوت کو دہرائے، تو وہ مایوسی کے ایک بغاوتی جذبہ
کے زیر اثر ہاتھ آسمان کی طرف اٹھا دیتا ہے اور کہتا ہے۔

"خدا ایمان دار انسان کی مدد کرتا ہے ... ... ایمان ... ... ایمان کی
کمائی میں برکت ... ... لعنت!"

گرم کوٹ میں اس بے کسی کی حد ہے۔ اور جب وہ الفاظ مصنف کی قلم سے نکلتے ہیں

"میں رفعت ذہنی کی زیادہ پرواکرتا ہوں اور ورسٹڈ کی کم"، تو بے اختیار اس بے کسی اور بغاوت

کی تصویر کو دیکھ کر آنسوامڈ آتے ہیں۔

"تلاداں میں طباع کپڑوں کو بھی انسانی یک جہتی کی راہ میں حائل سمجھتا ہے۔ یہی کمبخت جسم

سے ایک امیر اور غریب میں تفرقہ پیدا کر دیتے ہیں۔ گندم کھانے کے بعد انسان میں موت کی

پہلی علامت کپڑوں کی صورت میں نمودار ہوئی تھی۔ اس میں طباع مصنف نے جس چیز کی

طرف اشارہ کیا ہے وہ ہے بہت خطرناک، مگر بیدی بت شکن کی سی قسم کا انسان (ICONOCLAST)

ہے۔ لیکن جب ایک متروک الاستعمال فارمولزم ایک فضا کی صورت میں ہمارے گردوپیش چھا

جاتا ہے تو اس فضا میں طباع کا دم گھٹتا ہے۔ اور چونکہ ہر ایک انسان زندہ رہنا چاہتا ہے

اس لئے وہ بغاوت کرتا ہے ... ...

ایک طباع کا مذہب بنی نوع انسان سے پیار کرنا ہے۔ انسانیت سے بڑھ کر کوئی عالمگیر

مذہب نہیں۔ اتنی کلیت۔ اتنی عمومیت، اتنی وسعت رکھنے والی آغوش کے اندر ایک اور مذہب

مذہب کے اندر ذات پات اور فرقوں کے اندر جتھہ بندیوں کو طباع کا ادراک قبول نہیں کرتا، ایک

عام انسان کی بھی بہتر عقل اسے قبول نہیں کرتی۔ تلاداں میں اسی مذہب کی ایک جھلک ہے

"ایشور نے سب جیو جنتو کو ننگا کر کے اس دنیا میں بھیج دیا ہے۔ کوئی بولی دولی

نہیں دی، یہ نادار، لکھ پتی، مہا براہمن بھنوٹ، ہریجن، لنگوا فرنیکا سب کچھ

بعد میں لوگوں ہی نے ایجاد کر لیا ہے ... ..."

دس منٹ بارش میں۔

"لوہار، بڑھئی، چمڑہ رنگنے والے ایک براہمن گو چوبیس قدم، تاڑی پینے والے

تیس قدم ... ... پر سے پھر شٹ کر سکتے ہیں۔ میں ماں کو کہتا ہوں، ماں!
ان لوگوں کی وجہ سے تو ہم لوگ زندہ ہیں۔ پھر تھوڑی بہت برائی سچائی کو بچانی
کے لئے روز ازل سے زندہ ہے "

اس آخری سطر میں کتنا فلسفہ کتنا گہرا مطالعہ ہے۔ دنیا ایک IDEALIST کا
نقطۂ نظر ہی نہیں ہے۔ برائی ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گی۔ اس کے انسداد کی بےسود
کوشش کی بجائے اس سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ انسان کمزور ہے۔ اور اس سے انسانیت
دسرزد، ہوتی رہتی ہے۔ بلکہ انسان میں بربریت بھی بہت حد تک موجود ہے۔ اسی لئے
اقبال خدا سے مخاطب ہوتے ہوئے کہتا ہے ؎

روز حساب پیش ہو، جب مرا دفتر عمل
آپ بھی شرمسار ہو، مجھ کو بھی شرمسار کر

اس کلیت اور عمومیت کی ایک مق وہمدوش، ہیں بھی دکھائی دیتی ہے۔ جب
انسانوں پر مصیبت آتی ہے تو ایک قسم کی کامریڈشپ پیدا ہو جاتی ہے۔ پیٹ کے تنے ہونے
پر اور فارغ البالی میں وہ تنگ نظریے رکھتے ہیں۔ لیکن جب تلخ حقیقت سے دوچار
ہوتے ہیں۔ تو پھر وہ ایک ہی تھالی میں کھانا کھاتے ہوئے کہتے ہیں۔

"شفاخانے کے احاطے کی دیوار سے باہر سب کچھ ہے ... ... لیکن
یہاں کوئی ہندو ہے نہ مسلمان۔ نہ سکھ نہ عیسائی۔ گوڑ براہمن نہ اچھوت، یہاں
ایک ہی مذہب کے مریض بستے ہیں، جنھیں بیمار کہتے ہیں، جن کی نجات شفا ہے
جس کے حصول کے لئے وہ اپنی تمام تر کوششوں اور رہی سہی قوت کو صرف
کر ڈالتے ہیں۔"

ایک سکونی تماشہ گاہ :- خیال پیدا ہوتا ہے۔ کیا ایک سکونی تماشہ گاہ STATIC THEATRE ممکن الوجود ہے؟ بیدی کے نزدیک افسانہ ایک سکونی تماشہ ہے کیونکہ اس میں حرکات کی جگہ کیفیات ہوتی ہیں۔ یہ تھیٹر کیفیت MOOD کا ہے حرکت MOVEMENT کا نہیں۔ چونکہ یہ بات درست ہے کہ سب آرٹ SUGGESTION ہے، اس لئے افسانہ کے کردار چلتے پھرتے بولتے انسان سے کہیں زیادہ لسان ہوتے ہیں، بشرطیکہ سمجھنے والا فہم و فراست رکھے۔ مثلاً ہمدوش، میں چند ایک بوڑھے ایک دلہن کی چوڑیوں کی طرف دیکھتے ہیں دو لھا میاں اپنی بیوی کے منہ کی طرف ایک حاسدانہ جذبہ سے دیکھتے ہیں، اور بیوی سڑک کے قریب پڑے ہوئے کوڑے کرکٹ کی طرف دیکھ رہی ہے۔ بظاہر اس بیان میں کوئی خاص بات دکھائی نہیں دیتی، لیکن اس میں سب کچھ ہے۔ اسی افسانہ میں آگے چل کر ... ایک کردار کی رفیق زندگی مر جاتی ہے۔ اور ایک لاٹھی اس کی رفیق زندگی بن جاتی ہے۔ اب وہ ایک مبہم سے احساس کے ساتھ اسی بساطی کی دوکان کی طرف چلا جاتا ہے۔ جہاں اس نے اپنی بیماری کے ایام میں چند لڑکوں کو خرید و فروخت کرتے دیکھا تھا، اس کے دماغ کے گوشے میں وہ تاثرات اور بیوی کی یاد اس عرصہ تک محفوظ رہتی ہے۔ لیکن بیوی مر چکی ہے۔ اس لئے وہ لاٹھی کے لئے چند فیتے خرید کر کچھ غیر مطمئن کھویا کھویا سا گھر لوٹتا ہے۔

نفس تحت الشعور کی تشریح ردِ عمل میں مقام اوج کو پہنچ جاتی ہے۔ جلال اپنے ادیب چچا کی آخری سطور پڑھتا ہے۔ پھر ....

"اسے یوں محسوس ہوا، جیسے کئی زرد، نیلے، سرخ، مبہم سے حلقے ایک دوسرے کے ساتھ خلط ملط ہو کر اس کی آنکھوں کے پاس کنپٹی سے چھو کر انواع اقسام کی اقلیدسی اشکال پیدا کرتے ہوئے فضا میں دور و نزدیک پھیل رہے ہیں۔ اس کے ذہن

میں آہستہ آہستہ ایک خلجان سی پیدا ہوئی۔ ایک غنودگی یا نیم بے ہوشی کی سی حالت میں اس کے قلب میں یک لخت ایک تحریک، ایک زبردست رَد پیدا ہوئی، اور اس نے چاہا کہ وہ اپنے سامنے میز پر پڑی ہوئی پیالی کو اوندھا کردے۔ یہ مطلب، لا حاصل خواہش کیوں پیدا ہوئی، جلال نہ جان سکا۔ وہ صرف اس بات سے واقف تھا کہ ایک اندرونی طاقت اسے ایسا کہنے پر مجبور کر رہی تھی۔ ایک لمحہ کے لئے اس نے دل کے ساتھ تصفیہ کر لیا کہ وہ ہرگز ہرگز پیالی کے اوندھا کرنے سے فضول خیال کو عملی جامہ نہیں پہنائے گا ... بلکہ اس قسم کے فضول خیال کے پیدا ہونے پر اس نے اپنی کمزور طبیعت کو بہت کوسا۔ لیکن تھوڑی دیر کے بعد اس نے دیکھا کہ جب تک وہ پیالی کو اوندھا نہ کرلے گا۔ اس کے لئے زندہ رہنا مشکل ہو جائے گا ــــ مشکل ہی نہیں ناممکن ... ... اور سب کے دیکھتے ہوئے اس نے پیالی کو اوندھا کر دیا۔ تھوڑی سی چائے میز پر سے بہتی ہوئی فرش پر گر گئی۔ سب حیرت سے جلال کی طرف دیکھنے لگے ... ...

اس کے فوراً بعد ہی اس قسم کا خیال پیدا ہوا کہ وہ رو دے۔ اس وقت جلال نے اپنی ذہنی تحریک کے خلاف جانا بالکل بے سود سمجھا، وہ جانتا تھا کہ اب نہ رونا اس کے بس کا روگ نہیں، اس وقت اس نے اپنے آپ کو مکمل طور پر اس اندرونی حکم کے تابع کر دیا۔ اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا ... ...''

اس کے بعد اس کے دل میں خیال پیدا ہوتا ہے۔ کہ کہیں سگریٹ کو باہر پھینک دینے کا خیال اس کے ذہن میں نہ پیدا ہو جائے وہ کانپ اٹھتا ہے، اور برقی رو آنے سے پیشتر ایڑیوں کے بل چلتا ہوا کھڑکی میں سے سگریٹ کو باہر پھینک دیتا ہے ... ... دور بہت دور ــــ

اس نوبیداری کی حالت کو کس خوبی سے نبھایا گیا ہے۔

تاثیر و حسن قبول :- بیدی کی تحریر کے حسن قبول اور تاثیر سے کسی کو بھی انکار نہ ہو سکے گا۔ اس کی سکونی تمثیل پر سے پردہ اٹھتا ہے۔ تو فوراً ایک سادہ، پرکار تصویر دکھائی دیتی ہے کہ نظر ایک لمحہ کے لئے بھی ادھر اُدھر نہیں ہوتی۔

"دو بیاہے ہوئے بھائیوں کا ساری عمر ایک ہی گھر میں رہنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ خصوصاً جب کہ ان میں سے ایک تو صبح و شام گھی شکر میں ملا کر کھانا پسند کرے۔ اور دوسرا ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں کے لئے اپنی خوبصورت بیوی کے سامنے کانوں کا کچا ہے"

چھوکری کی لوٹ

"دھوبی کے گھر میں گورا چٹا چھوکرا پیدا ہو جائے، تو اس کا نام بابو رکھ دیتے ہیں"

نادان

"ابو بکر روڈ شام کے اندھیرے میں گم ہو رہی ہے ... ... یوں دکھائی دیتا ہے جیسے کوئی گندہ سا راستہ ایک کوٹھے کی کان میں چلا گیا ہے"

دس منٹ بارش میں

تضمین و تجدید :- بعض جگہ یوں دکھائی دیتا ہے کہ فن کار نے منشی پریم چند سے کسب نور کیا ہے۔ اس بات میں شک نہیں کہ منشی پریم چند نے اسے متاثر ضرور کیا ہوگا۔ لیکن بیدی کے افسانے "پان شاپ"، "ہمدوش"، "گرم کوٹ"، "کوارنٹین"، "ردعمل"، "حیاتین ب"، "دس منٹ بارش میں" اور "موت کا راز" بہ لحاظ ٹیکنک اور جزئیات نگاری وغیرہ کے منشی پریم چند کے افسانوں اور ہمارے موجودہ اردو ادب سے بالکل الگ ہٹ کر ہیں۔ اور وہ ایک نہایت شاندار مستقبل کی نوید دیتے ہیں۔ دیہاتی معاشرت کو تحریر کرنے کے معاملہ میں بھی بیدی نے اپنے پیشروؤں پر تضمین کی ہے۔ اور بعض بعض جگہ تجدید بھی۔ وہ جگہ جگہ اشاروں TOUCHES

میں آہستہ آہستہ ایک خلجان سی پیدا ہوئی۔ایک غنودگی یا نیم بے ہوشی کی سی حالت
میں اس کے قلب میں یک لخت ایک تحریک،ایک زبردست رَو پیدا ہوئی، اور اس
نے چاہا کہ وہ اپنے سامنے میز پر پڑی ہوئی پیالی کو اوندھا کردے۔یہ مطلب، لا حاصل
خواہش کیوں پیدا ہوئی، جلال نہ جان سکا۔ وہ صرف اس بات سے واقف تھا کہ ایک
اندرونی طاقت اسے ایسا کہنے پر مجبور کر رہی تھی۔ ایک لمحہ کے لئے اس نے دل کے ساتھ
تصفیہ کر لیا کہ وہ ہرگز ہرگز پیالی کے اوندھا کرنے سے فضول خیال کو عملی جامہ نہیں پہنائے
گا... ... بلکہ اس قسم کے فضول خیال کے پیدا ہونے پر اس نے اپنی کمزور طبیعت کو بہت
کوسا لیکن تھوڑی دیر کے بعد اس نے دیکھا کہ جب تک وہ پیالی کو اوندھا نہ کرلے گا۔اس
کے لئے زندہ رہنا مشکل ہو جائے گا___ مشکل ہی نہیں ناممکن.. ... اور سب کے
دیکھتے ہوئے اس نے پیالی کو اوندھا کر دیا۔تھوڑی سی چائے میز پر سے بہتی ہوئی فرش پر
گر گئی۔سب حیرت سے جلال کی طرف دیکھنے لگے ... ...
اس کے فوراً بعد ہی اس قسم کا خیال پیدا ہوا کہ وہ رو دے۔اس وقت جلال نے اپنی ذہنی
تحریک کے خلاف جانا بالکل بے سود سمجھا، وہ جانتا تھا کہ اب نہ رونا اس کے بس کا روگ
نہیں،اس وقت اس نے اپنے آپ کو مکمل طور پر اس اندرونی حکم کے تابع کر دیا۔اور پھوٹ
پھوٹ کر رونے لگا ... ...''

اس کے بعد اس کے دل میں خیال پیدا ہوتا ہے۔کہ کہیں سگریٹ کو باہر پھینک دینے
کا خیال اس کے ذہن میں نہ پیدا ہو جائے وہ کانپ اٹھتا ہے،اور برقی رو آنے سے پیشتر ایڑیوں
کے بل چلتا ہوا کھڑکی میں سے سگریٹ کو باہر پھینک دیتا ہے ... ... دور بہت دور___
اس نو بیداری کی حالت کو کس خوبی سے نبھایا گیا ہے۔

تاثیر و حسن قبول :- بیدی کی تحریر کے حسن قبول اور تاثیر سے کسی کو بھی انکار نہ ہو سکے گا۔ اس کی سکوتی تمثیل پر سے پردہ اٹھتا ہے۔ تو فوراً ایک سادہ پرکار تصویر دکھائی دیتی ہے کہ نظر ایک لمحہ کے لئے بھی اِدھر اُدھر نہیں ہوتی۔

"دو بیاہے ہوئے بھائیوں کا ساری عمر ایک ہی گھر میں رہنا بہت مشکل ہوتا ہے خصوصاً جب کہ ان میں سے ایک تو صبح و شام گھی شکر میں ملا کر کھانا پسند کرے۔ اور دوسرا ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں کے لئے اپنی خوبصورت بیوی کے سامنے کانوں کا کچا ہے"

چھوکری کی لوٹ

"دھوبی کے گھر میں گورا چٹا چھوکرا پیدا ہو جائے، تو اس کا نام بابو رکھ دیتے ہیں"

نادان

"ابو بکر روڈ شام کے اندھیرے میں گم ہو رہی ہے ... ... یوں دکھائی دیتا ہے جیسے کوئی کشادہ سا راستہ ایک کوٹلے کی کان میں چلا گیا ہے"

دس منٹ بارش میں

تضمین و تجدید :- بعض جگہ یوں دکھائی دیتا ہے کہ فن کار نے منشی پریم چند سے کسب نور کیا ہے۔ اس بات میں شک نہیں کہ منشی پریم چند نے اسے متاثر ضرور کیا ہوگا۔ لیکن بیدی کے افسانے "پان شاپ"، "ہمدوش"، "گرم کوٹ"، "کوارنٹین"، "ردعمل"، "حیاتین ب"، "دس منٹ بارش میں"، اور "موت کا راز" بہ لحاظ ٹیکنک اور جزئیات نگاری وغیرہ کے منشی پریم چند کے افسانوں اور ہمارے موجودہ اردو ادب سے بالکل الگ ہٹ کر ہیں۔ اور وہ ایک نہایت شاندار مستقبل کی نوید دیتے ہیں۔ دیہاتی معاشرت کو تحریر کرنے کے معاملہ میں بھی بیدی نے اپنے پیشرؤوں پر تضمین کی ہے۔ اور بعض بعض جگہ تجدید بھی۔ وہ جگہ جگہ اشاروں TOUCHES

میں چابک دستی سے کام لیتا ہے۔ "بھولا" میں "ستارہ" ایک نہایت شاندار رخ ہے "ہمدوش" میں
موے کی مادہ کے تین بار آنے کا مقصد سوائے مجھتی ہوئی زندگی اور تخلیق زندگی کے تقابل کے اور
کچھ نہیں۔ "رنڈوے ہاتھ" اور "حیاتین ج" سے ننھی مسکراہٹ کی سی ترکیبیں بالکل نئی ہیں۔ تکرار فضا
کہانیوں کو چار چاند لگا دیتی ہے۔ کہیں داخلیت ہے اور کہیں خارجیت۔ "دس منٹ بارش میں"
اور "موت کا راز" بہت بلند پایہ افسانے ہیں۔ آج سے بیس سال بعد اس مستقبل نگار کے ان افسانوں
کو کوئی سمجھے گا۔ محض ایک کاروباری نقطۂ نگاہ سے مصنف نے انھیں مجموعہ میں سب سے آخر
رکھا ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ بیدی صاحب نے یہ افسانے POT-BOILER کے طور پر نہیں
لکھے۔ شاید یہی ان کی کامیابی کی دلیل ہے۔ اگر میں مبالغہ سے کام نہیں لیتا۔ تو بیدی ایک
COLOSSUS ہے۔ جو حقیقت کا جویندہ، یابندہ اور پھر منتقل کنندہ ہے۔ اس کی تحریریں
خلوص کلیت اور کامریڈ شپ پائی جاتی ہے۔

بطور ان کے بزرگ کے میری دعا ہے کہ وہ خوب پھلیں پھولیں۔ اور ہمارے پس افتادہ
ادب میں نئی زندگی پھونک دیں۔

ہنسراج ایڈیٹر "اتالیق" لاہور

بھولا

بھولا

میں نے بابا کو بیٹھ کر ایک کوزے میں مکھن رکھتے دیکھا۔ چھاچھ کی کھٹائی کو دور کرنے کے لئے بابا نے کنوئیں کے صاف پانی سے کوزے میں پڑے ہوئے مکھن کو کئی بار دھویا۔ اس طرح مکھن کے جمع کرنے کی کوئی خاص وجہ تھی۔ ایسی بات عموماً بابا کے کسی عزیز کی آمد کا پتہ دیتی تھی ہاں! اب مجھے یاد آیا دو دن کے بعد بابا کا بھائی اپنی بیوہ بہن سے راکھی بندھوانے کے لئے آنے والا تھا۔ یوں تو اکثر بہنیں بھائیوں کے ہاں جاکر انہیں راکھی باندھتی ہیں۔ مگر بابا کا بھائی اپنی بہن اور بھانجے سے ملنے کے لئے خود ہی آجایا کرتا تھا۔ اور راکھی بندھوا لیا کرتا تھا۔ راکھی بندھوا کر وہ اپنی بیوہ بہن کو یہی یقین دلاتا تھا کہ اگرچہ اس کا سہاگ لٹ گیا ہے۔ مگر جب تک اس کا بھائی زندہ ہے وہ اس کی رکھشا، اس کی حفاظت کی ذمہ داری اپنے کندھوں پر لیتا ہے۔

ننھے بھولے نے میری اس بات کی تصدیق کر دی۔ گنا چوستے ہوئے اس نے کہا۔

"بابا۔ پرسوں ماموں جی آئیں گے نا—؟"

میں نے اپنے پوتے کو پیار سے گود میں اُٹھا لیا۔ بھولے کا جسم بہت نرم و نازک تھا۔ اور اس کی آواز بہت سریلی تھی۔ جیسے کنول کی پتیوں کی نزاکت اور سپیدی، گلاب کی سُرخی اور بلبل کی خوش الحانی کو اکٹھا کر دیا گیا ہو۔ اگرچہ بھولا میری لمبی اور گھنی داڑھی سے گھبرا کر مجھے اپنا منہ چومنے کی اجازت نہ دیتا تھا۔ تاہم میں نے زبردستی اس کے سُرخ گالوں پر پیار کی مہر ثبت کر دی۔ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"بھولے — تیرے ماموں جی ...... تیری ماتا جی کے کیا ہوتے ہیں۔؟"

بھولے نے کچھ تامل کے بعد جواب دیا۔ "ماموں جی"

بابا نے استوتر پڑھنا چھوڑ دیا۔ اور کھلکھلا کر ہنسنے لگی۔ میں اپنی بہو کے اس طرح کھِل کر ہنسنے پر دل ہی دل میں بہت خوش ہوا۔ بابا بیوہ تھی اور سماج اُسے اچھے کپڑے پہننے اور خوشی کی بات میں حصہ لینے سے بھی روکتی تھی۔ میں نے بارہا بابا کو اچھے کپڑے پہننے، ہنسنے کھیلنے کی تلقین کرتے ہوئے سماج کی پرواہ نہ کرنے کے لئے کہا تھا۔ مگر بابا نے از خود اپنے آپ کو سماج کے روح فرسا احکام کے تابع کر دیا تھا۔ اس نے اپنے تمام اچھے کپڑے اور زیورات کی پٹاری ایک صندوق میں مقفل کر کے چابی ایک جوہڑ

میں پھینک دی تھی۔

بابا نے ہنستے ہوئے اپنا پاٹھ جاری رکھا۔

ہری ہر، ہری ہر، ہری ہر ہری
میری بار کیوں دیر اتنی کری۔

پھر اس نے اپنے لعل کو پیار سے بلاتے ہوئے کہا۔

"بھولے ــــ تم ننھی کے کیا ہوتے ہو؟"

"بھائی" بھولے نے جواب دیا۔

"اسی طرح تیرے ماموں جی میرے بھائی ہیں"۔

بھولا یہ بات نہ سمجھ سکا کہ ایک ہی شخص کس طرح ایک ہی وقت میں کسی کا بھائی اور کسی کا ماموں ہو سکتا ہے۔ وہ تو اب تک یہی سمجھتا آیا تھا کہ اس کے ماموں جان اس کے باباجی کے بھی ماموں جی ہیں۔ بھولے نے اس مخمصے میں پڑنے کی کوشش نہ کی اور اچک کر ماں کی گود میں جا بیٹھا اور اپنی ماں سے گیتا سنانے پر اصرار کرنے لگا۔ وہ گیتا محض اس وجہ سے سنتا تھا۔ کہ وہ کہانیوں کا شوقین تھا۔ اور گیتا کے ادھیائے کے آخر میں مہاتم سن کر وہ بہت خوش ہوتا۔ اور پھر جوہڑ کے کنارے اگی ہوئی دوب کی مخملی تلواروں میں بیٹھ کر گھنٹوں ان مہاتموں پر غور کیا کرتا۔

مجھے دوپہر کو اپنے گھر سے چھ میل دور اپنے مزارعوں کو ہل پہنچانے تھے۔ بوڑھا جسم۔ تس پر مصیبتوں کا مارا ہوا۔ جوانی کے عالم میں تین تین من بوجھ اٹھا کر دوڑا کیا۔ مگر اب بیس سیر بوجھ کے نیچے گردن چٹکنے لگتی ہے۔ بیٹے کی موت نے امید کو یاس میں تبدیل کر کے کمر توڑ دی تھی اب میں بھولے کے سہارے ہی جیتا تھا ورنہ در اصل میں مر چکا تھا۔

رات کو میں تھکن کی وجہ سے بستر پر لیٹتے ہی اونگھنے لگا۔ ذرا دیر میں مایا نے مجھے آواز دی کہ دودھ پی لو۔ میں اپنی بہو کی سعادت مندی پر دل ہی دل میں بہت خوش ہوا میں نے اسے سینکڑوں دعائیں دیتے ہوئے کہا۔
"مجھ بوڑھے —— کی اتنی پروانہ کیا کرو بیٹا۔"

—— بھولا ابھی تک نہ سویا تھا۔ اس نے ایک چھلانگ لگائی اور میرے پیٹ پر چڑھ گیا۔ بولا۔

"بابا جی، آپ آج کہانی نہیں سنائیں گے کیا؟"

"نہیں بیٹا" —— میں نے آسمان پر نکلے ہوئے ستاروں کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "میں آج بہت تھک گیا ہوں —— کل دوپہر کو تمہیں سناؤں گا۔"

بھولے نے روٹھتے ہوئے جواب دیا۔ "میں تمہارا بھولا نہیں بابا۔ میں ماتا جی کا بھولا ہوں۔"

بھولا بھی جانتا تھا۔ کہ میں نے اس کی ایسی بات کبھی برداشت نہیں کی۔ میں ہمیشہ اس سے یہی سننے کا عادی تھا کہ "بھولا بابا جی کا ہے اور ماتا جی کا نہیں۔" مگر اس دن بھولوں کو کندھے پر اُٹھا کر چھ میل تک لے جانے اور پیدل ہی واپس آنے کی وجہ سے میں بہت تھک گیا تھا۔ شاید میں اتنا نہ تھکتا۔ اگر میرا نیا جوتا ایڑی کو نہ دباتا اور اس وجہ سے میرے پاؤں میں ٹیسیں نہ اُٹھتیں۔ اس غیر معمولی تھکن کے باعث میں نے بھولے کی وہ بات بھی برداشت کی۔ میں آسمان پر ستاروں کو دیکھنے لگا۔ آسمان کے جنوبی گوشے میں ایک ستارہ مشعل کی مانند روشن تھا۔ غور سے دیکھنے پر وہ مدہم سا ہونے لگا ـــ میں اونگھتے اونگھتے سو گیا۔

صبح اُٹھتے ہی میرے دل میں خیال آیا۔ کہ بھولا سوچتا ہو گا۔ کہ کل رات بابا نے میری بات کس طرح برداشت کی ہے۔ میں اس خیال سے لرز گیا کہ بھولے کے دل میں کہیں یہ خیال نہ آیا ہو۔ کہ اب بابا میری پرواہ نہیں کرتا۔ شاید یہی وجہ تھی۔ کہ صبح کے وقت اس نے میری گود میں آنے سے انکار کر دیا۔ اور بولا۔

"میں نہیں آؤں گا ـــ تیرے پاس بابا!"

"کیوں بھولے؟"

"بھولا بابا جی کا نہیں ـــ بھولا ماتا جی کا ہے۔"

میں نے بھولے کو مٹھائی کے لالچ سے منالیا۔ اور چند ہی لمحات میں بھولا باباجی کا بن گیا۔ اور میری گود میں آگیا۔ اور اپنی ننھی ٹانگوں کے گرد میرے جسم سے لپٹے ہوئے کمبل کو لپیٹنے لگا۔ مایا ہری ہرا ستوتر پڑھ رہی تھی۔ پھر اس نے پاؤ بھر مکھن نکالا۔ اور اسے کوزے میں ڈال کر کنوئیں کے صاف پانی سے چھاچھ کی کھٹائی کو دھو ڈالا۔ اب مایا نے اپنے بھائی کے لئے سیر کے قریب مکھن تیار کر لیا تھا۔ میں بہن بھائی کے اس پیار کے جذبہ پر دل ہی دل میں خوش ہو رہا تھا۔ اتنا خوش کہ میری آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے۔ میں نے دل میں کہا۔ عورت کا دل محبت کا ایک سمندر ہوتا ہے۔ ماں باپ، بھائی بہن، خاوند بچے سب سے وہ بہت ہی پیار کرتی ہے۔ اور اتنا کرنے پر بھی وہ ختم نہیں ہوتا۔ ایک دل کے ہوتے ہوئے بھی وہ سب کو اپنا دل دے دیتی ہے۔ بھولے نے دونوں ہاتھ میری گالوں کی جھریوں پر رکھے، مایا کی طرف سے چہرے کو ہٹا کر اپنی طرف کر لیا اور بولا۔

"بابا تمہیں اپنا وعدہ یاد ہے نا ——؟"

"کس بات کا —— بیٹا؟"

"تمہیں آج دوپہر کو مجھے کہانی سنانی ہے۔"

"ہاں بیٹا" —— میں نے اس کا منہ چومتے ہوئے کہا۔

یہ تو بھولا ہی جانتا ہوگا۔ کہ اس نے دوپہر کے آنے کا کتنا انتظار
کیا۔ بھولے کو اس بات کا علم تھا۔ کہ باباجی کے کہانی سنانے کا وقت
وہی ہوتا ہے۔ جب وہ کھانا کھا کر اس پلنگ پر جا لیٹتے ہیں جس پر
وہ باباجی یا ماتاجی کی مدد کے بغیر نہیں چڑھ سکتا۔ چنانچہ وقت سے
آدھ گھنٹہ پیشتر ہی اس نے کھانا نکلوانے پر اصرار شروع کر دیا۔ میرے
کھانے کے لئے نہیں۔ بلکہ اپنے کہانی سننے کے چاؤ سے۔

میں نے معمول سے آدھ گھنٹہ پہلے کھانا کھایا۔ ابھی آخری نوالہ
میں نے توڑا ہی تھا کہ پٹواری نے دروازے پر دستک دی۔ اسکے ہاتھ
میں ایک ہلکی سی جریب تھی۔ اس نے کہا۔ کہ خانقاہ والے کنوئیں پر آپ
کی زمین کو ناپنے کے لئے مجھے آج ہی فرصت مل سکتی ہے پھر نہیں۔

دالان کی طرف نظر دوڑائی تو میں نے دیکھا۔ بھولا چارپائی کے
چاروں طرف گھوم کر بستر بچھا رہا تھا۔ بستر بچھانے کے بعد اس نے
ایک بڑا سا تکیہ بھی ایک طرف رکھ دیا۔ اور خود پائینتی میں پاؤں اڑا کر
چارپائی پر چڑھنے کی کوشش کرنے لگا۔ اگرچہ بھولے کا مجھے اصرار
سے جلد روٹی کھلانا اور بستر بچھا کر میری تواضع کرنا اپنی خودغرضی
پر مبنی تھا۔ تاہم ایک خیال کے دل میں آنے پر میں نے کہا۔
"آخر بابا کا بیٹا ہی ہے نا ـــــ ایشور اس کی عمر دراز کرے۔"

میں نے پٹواری سے کہا کہ تم خانقاہ والے کنوئیں کو چلو۔ اور میں تمہارے پیچھے پیچھے آجاؤں گا۔ جب بھولے نے دیکھا کہ میں باہر جانے کے لئے تیار ہوں۔ تو اس کا چہرہ اس طرح مدہم پڑ گیا جس طرح گذشتہ شب کو آسمان کے ایک کونے میں ایک مشعل کی مانند روشن ستارہ مسلسل دیکھتے رہنے کی وجہ سے ماند پڑ گیا تھا۔ مایا نے کہا۔

"باباجی۔ اتنی بھی جلدی کیا ہے؟ —— خانقاہ والا کنواں کہیں دور تو بھاگا نہیں جاتا —— آپ کم سے کم آرام تو کر لیں۔"

"اوں ہوں" میں نے زیر لب کہا۔ "پٹواری واپس ہو گیا۔ تو پھر یہ کام ایک ماہ سے اِدھر نہ ہو سکے گا۔"

مایا خاموش ہو گئی۔ بھولا منہ بسورنے لگا۔ اُس کی آنکھیں نمدار سی ہو گئیں۔ اس نے کہا۔ "بابا میری کہانی —— میری کہانی ——"

"بھولے —— میرے بچے" میں نے بھولے کو ٹالتے ہوئے کہا۔ "دن کو کہانی سنانے سے مسافر راستہ بھول جاتے ہیں۔"

"راستہ بھول جاتے ہیں؟" بھولے نے سوچتے ہوئے ہو کہا۔ بابا تم جھوٹ بولتے ہو —— میں باباجی کا بھولا نہیں بنتا۔"

اب جب کہ میں تھکا ہوا بھی نہیں تھا۔ اور پندرہ بیس منٹ استراحت کے لئے نکال سکتا تھا۔ میں بھولے کی اس بات کو آسانی سے

کس طرح برداشت کر لیتا ۔ میں نے اپنے شانے سے چادر اتار کر چارپائی کی پائینتی پر رکھی اور اپنی دبتی ہوئی ایڑی کو جوتی کی قید بامشقت سے نجات دلاتے ہوئے پلنگ پر لیٹ گیا ۔ بھولا پھر اپنے بابا کا بن گیا ۔ لیٹتے ہوئے میں نے بھولے سے کہا ۔

"اب کوئی مسافر راستہ کھو بیٹھے ——— تو اس کے تم ذمہ دار ہو "

——— اور میں نے بھولے کو دوپہر کے وقت سات شہزادوں اور سات شہزادیوں کی ایک لمبی کہانی سنائی ۔ کہانی میں ان کی باہمی شادی کو میں نے معمول سے زیادہ دلکش انداز میں بیان کیا ۔ بھولا ہمیشہ اس کہانی کو پسند کیا کرتا تھا ۔ جس کے آخر میں شہزادہ اور شہزادی کی شادی ہو جائے مگر میں نے اُس روز بھولے کے منہ پر خوشی کی علامت نہ دیکھی ۔ بلکہ وہ ایک افسردہ سا منہ بنائے خفیف طور پہ کانپتا رہا ۔

(۲)

اس خیال سے کہ ہوّاری خانقاہ والے کنوئیں پر انتظار کرتے کرتے تھک کر اپنی ہلکی ہلکی جھنکار پیدا کرنے والی جریب جیب میں ڈال کر کہیں اپنے گاؤں کا رُخ نہ کرے ۔ میں جلدی جلدی مگر اپنے نئے جوتے میں دبتی ہوئی ایڑی کی وجہ سے لنگڑاتا ہوا بھاگا ۔ گویا میں نے جوتی کو

سرسوں کا تیل لگا دیا تھا۔ تاہم وہ نرم مطلق نہ ہوئی تھی۔

شام کو جب میں واپس آیا۔ تو میں نے بھولے کو خوشی سے دالان سے صحن میں اور صحن سے دالان میں کودتے پھاندتے دیکھا۔ وہ لکڑی کے ایک ڈنڈے کو گھوڑا بنا کر اُسے بھگا رہا تھا۔ اور کہتا تھا۔

"چل ماموں جی کے دیس —— رے گھوڑے۔ ماموں جی کے دیس ماموں جی کے دیس۔ ہاں ہاں۔ ماموں جی کے دیس۔ گھوڑے۔۔۔۔"

جونہی میں نے دہلیز میں قدم رکھا۔ بھولے نے اپنا گانا ختم کر دیا۔ اور بولا۔

"بابا —— آج ماموں جان آئیں گے نا —— ؟"

"پھر کیا ہو گا بھولے —— ؟" میں نے پوچھا۔

"ماموں جی اگن بوٹ لائیں گے۔ ماموں جی کلّو کتا، لائیں گے۔ ماموں جی کے سر پر مکی کے بھٹوں کا ڈھیر ہو گا نا بابا —— ہمارے یہاں تو مکی ہوتی ہی نہیں —— بابا۔ اور تو اور۔۔۔۔ ایسی مٹھائی لائیں گے جو آپ نے خواب میں بھی نہ دیکھی ہو گی۔"

میں حیران تھا۔ اور سوچ رہا تھا۔ کہ کس خوبی سے "خواب میں بھی نہ دیکھی ہو گی" کے الفاظ سات شہزادوں اور سات شہزادیوں والی کہانی کے بیان میں سے اس نے یاد رکھے تھے۔ "جیتا رہے" میں نے دعا

دیتے ہوئے کہا۔ بہت ذہین لڑکا ہوگا اور ہمارے نام کو روشن کریگا۔"
شام ہوتے ہی بھولا دروازے میں جا بیٹھا۔ تاکہ ماموں جی کی شکل
دیکھتے ہی اندر کی طرف دوڑے اور پہلے پہل اپنی ماتا جی کو اور پھر مجھے اپنے
ماموں جی کے آنے کی خبر سنائے۔
دیوں کو دیا سلائی دکھائی گئی۔ جوں جوں رات کا اندھیرا گہرا ہوتا
جاتا توں توں دیوں کی روشنی زیادہ ہوتی جاتی۔ متفکرانہ لہجہ میں بابا نے کہا۔
"باباجی —— بھیا ابھی تک نہیں آئے۔"
"کسی کام کی وجہ سے ٹھہر گئے ہونگے۔"
"ممکن ہے کوئی ضروری کام آپڑا ہو —— راکھی کے روپے ڈاک میں
بھیج دیں گے ——"
"مگر راکھی؟"
"ہاں راکھی کی کہو . . . . . . انہیں اب تک تو آجانا چاہیئے تھا۔"
میں نے بھولے کو زبردستی دروازے کی دہلیز پر سے اٹھایا۔ بھولے
نے اپنی ماتا سے بھی زیادہ متفکرانہ لہجہ میں کہا۔ "ماتا جی —— ماموں جی کیوں
نہیں آئے۔؟"
بابا نے بھولے کو گود میں اٹھاتے ہوئے اور پیار کرتے ہوئے کہا
"شاید صبح کو آجائیں —— تیرے ماموں جی —— میرے بھولے۔"

پھر بھولے نے اپنے نرم ونازک بازوؤں کو اپنی ماں کے گلے میں ڈالتے ہوئے کہا۔"میرے ماموں جی تمہارے کیا ہوتے ہیں؟"

"جو تم ننھی کے ہو۔"

"بھائی؟"

"تم جانو——"

"اور منی (بھولے کا دوست) کے کیا ہوتے ہیں؟"

"کچھ بھی نہیں——"

"بھائی بھی نہیں؟"

"نہیں——"

——اور بھولا اس عجیب بات کو سوچتا ہوا سو گیا۔ جب میں اپنے بستر پر لیٹا۔ تو پھر وہ مشعل کی مانند چمکتا ہوا ستارہ آسمان کے ایک کونے میں میرے گھورنے کی وجہ سے ماند ہوتا ہوا دکھائی دیا۔ مجھے پھر بھولے کا چہرہ یاد آ گیا۔ جو میرے خانقاہ والے کنوئیں کو جانے پر طیار ہونے کی وجہ سے یوں ہی ماند پڑ گیا تھا۔ کتنا شوق ہے۔ بھولے کو کہانیاں سننے کا۔ وہ اپنی ماں کو استوتر بھی پڑھنے نہیں دیتا۔ اتنا بچہ بھلا گیتا کو کیا سمجھے۔ مگر صرف اس وجہ سے کہ اس کے ادھیائے کا مہاتم ایک دلچسپ کہانی ہوتا ہے۔ وہ نہایت صبر سے ادھیائے کے ختم ہونے اور مہاتم کے شروع ہونے

کا انتظار کیا کرتا ہے۔

"بابا کا بھائی ابھی تک نہیں آیا۔ شاید نہ آئے۔" میں نے دل میں کہا۔ "اسے اپنی بہن کا پیار سے جمع کیا ہوا مکھن کھانے کے لئے تو آجانا چاہیئے۔" میں ستاروں کی طرف دیکھتے دیکھتے اونگھنے لگا۔ یکایک بابا کی آواز سے میری نیند کھلی۔

وہ دودھ کا کٹورا لئے کھڑی تھی۔

"میں نے کئی بار کہا ہے ——— تم میرے لئے اتنی تکلیف نہ کیا کرو" میں نے کہا۔

دودھ پینے کے بعد فرطِ شفقت سے میرے آنسو نکل آئے۔ حد سے زیادہ خوش ہوکر میں بابا کو یہی دعا دے سکتا تھا کہ وہ سہاگ دتی رہے۔ کچھ ایسا ہی میں نے کہنا چاہا۔ آہ! مگر اس خیال کے آنے سے کہ اس کا سہاگ نو برس ہوئے لٹ گیا تھا۔ میں نے کچھ نہ کچھ کہنے کی غرض سے اپنی رقت کو دباتے ہوئے کہا۔

"بیٹی ——— تمہیں اس سیوا کا پھل ملے بغیر نہ رہے گا۔"

پھر میرے پہلو میں بچھی ہوئی چارپائی پر سے بھولا نتھی کو جو کہ اس کے ساتھ ہی سو رہی تھی۔ پرے دھکیلتے ہوئے اور آنکھیں ملتے ہوئے اٹھا۔ اٹھتے ہی اس نے کہا۔

"بابا ــــ ماموں جی ابھی تک کیوں نہیں آئے؟"

"آجائیں گے ــــ بیٹا۔ سوجاؤ۔ وہ صبح سویرے آجائیں گے۔"

اپنے بیٹے کو اپنے ماموں کے لیئے اس قدر بیتاب دیکھ کر مایا بھی کچھ بیتاب سی ہوگئی۔ عین اس طرح جس طرح ایک شمع سے دوسری شمع روشن ہوجاتی ہے۔ کچھ دیر کے بعد وہ بھولے کو لٹا کر تھپکنے لگی۔

مایا کی آنکھوں میں بھی نیند آنے لگی۔ یوں بھی جوانی میں نیند کا غلبہ ہوتا ہے۔ اور پھر دن بھر کام کاج کر کے تھک جانے کی وجہ سے مایا گہری نیند سوتی تھی میری نیند تو عام بوڑھوں کی سی نیند تھی۔ کبھی ایک آدھ گھنٹہ تک سو لیتا۔ پھر دو گھنٹے جاگتا رہتا۔ پھر کچھ دیر اونگھنے لگ جاتا۔ اور باقی رات اختر شماری کرتے گزار دیتا۔ میں نے مایا کو سو جانے کے لیئے کہا۔ اور بھولے کو اپنے پاس لٹا لیا۔

"بتی جلتی رہنے دو۔ صرف دھیمی کر دو ــــ میلے کی وجہ سے بہت سے چور چکار اِدھر اُدھر گھوم رہے ہیں ــــ" میں نے سوئی ہوئی مایا سے کہا۔

سب سے بڑی بات یہ تھی۔ کہ اس دفعہ میلہ پر جو لوگ آئے تھے اُن میں ایسے آدمی بھی تھے۔ جو کہ ننھے ننھے بچوں کو اغوا کر کے لے جاتے۔ پڑوس کے ایک گاؤں میں دو ایک ایسی وارداتیں ہوئی تھیں، اور اسی

لئے میں نے بھولے کو اپنے پاس لٹا لیا تھا۔ میں نے دیکھا۔ بھولا جاگ رہا تھا۔ اس کے بعد میری آنکھ لگ گئی۔

تھوڑی دیر کے بعد جب میری آنکھ کھلی۔ تو میں نے بتی کو دیوار پر نہ دیکھا۔ میں نے گھبرا کر ہاتھ پسارا تو دیکھا کہ بھولا بھی بستر پر نہ تھا۔ میں نے اندھوں کی طرح در و دیوار سے ٹکراتے اور ٹھوکریں کھاتے ہوئے تمام چارپائیوں پر دیکھا۔ بابا کو بھی جگایا۔ گھر کا کونہ کونہ چھانا —— بھولا کہیں نہ تھا —— !!

(۳)

"بابا —— ہم لٹ گئے۔" میں نے اپنا سر پیٹتے ہوئے کہا۔

بابا ماں تھی۔ اس کا کلیجہ جس طرح شق ہوا۔ یہ کوئی اسی سے پوچھے۔ اپنے سہاگ لٹنے پر اس نے اتنے بال نہ نوچے تھے۔ جتنے کہ اس نے اُس وقت نوچے۔ اس کا دل بیٹھا جا رہا تھا اور وہ دیوانوں کی طرح چیخیں مار رہی تھی۔ پاس پڑوس کی عورتیں شور سن کر جمع ہو گئیں۔ اور بھولے کی گمشدگی کی خبر سن کر رونے پیٹنے لگیں۔

میں عورتوں سے بھی زیادہ پیٹ رہا تھا۔ آج میں نے ایک بازیگر کو اپنے گھر کے اندر گھورتے بھی دیکھا تھا۔ مگر میں نے پروا نہیں کی تھی۔ آہ!

وہ وقت کہاں سے ہاتھ آئے۔ میں نے دعائیں کیں۔ کہ کسی وقت کا دیا کام آجائے۔ منتیں مانیں۔ کہ بھولا اہل جلئے۔ وہی اندھیرے گھر کا اجالا تھا اسی کے دم سے میں اور مایا جیتے تھے۔ اسی کی آس سے ہم اڑے پھرتے تھے۔ وہی ہماری آنکھوں کی بینائی وہی ہمارے جسم کی توانائی تھا۔ اس کے بغیر ہم کچھ نہ تھے۔

میں نے گھوم کر دیکھا۔ مایا بے ہوش ہوگئی تھی۔ اس کے ہاتھ اندر کی طرف مڑ گئے تھے نسیں کھچی ہوئی اور آنکھیں پتھرائی ہوئی تھیں۔ اور عورتیں اس کی ناک بند کر کے ایک چمچہ سے اس کے دانت کھولنے کی کوشش کر رہی تھیں۔

میں سچ کہتا ہوں۔ ایک لمحہ کے لئے میں بھولے کو بھی بھول گیا۔ میرے پاؤں تلے کی زمین نکل گئی۔ ایک ساتھ گھر کے دو بشر جب دیکھتے دیکھتے ہاتھوں سے چلے جائیں۔ تو اس وقت دل کی کیا کیفیت ہوتی ہے۔ میں نے ایشور کو لرزتے ہوئے بُرا بھلا کہا۔ کہ اِن دکھوں کے دیکھنے سے پیشتر اس نے میری ہی جان کیوں نہ لے لی۔ آہ! مگر جس کی قضا آتی ہے۔ اسکے سوا کسی اور کا بال تک بیکا نہیں ہوتا۔

قریب تھا۔ کہ میں بھی مایا کی طرح گر پڑوں کہ مایا ہوش میں آگئی۔ مجھے پہلے سے کچھ سہارا ملا۔ میں نے دِل میں کہا۔ کہ میں ہی مایا کو سہارا

دے سکتا ہوں۔ اور اگر میں خود اس طرح حوصلہ چھوڑ دوں۔ تو مایا کسی طرح
نہیں بچ سکتی۔ میں نے حواس جمع کرتے ہوئے کہا۔
"بابا بیٹی —— دیکھو! میرا یوں خانہ خراب مت کرو —— حوصلہ کرو۔
جن کے کبھی بچے اغوا کئے گئے ہیں۔ آخر مل بھی جاتے رہے ہیں۔ بازیگر
بچوں کو مارنے کے لئے نہیں لے جاتے۔ پال کر بڑا کر کے کسی کام میں
لانے کے لئے لے جاتے ہیں —— بھولا مل جائے گا۔"
ماں کے لئے یہ الفاظ بے معنی تھے۔ مجھے بھی اپنے اس طرح صبر
کرنے پر گمان ہوا۔ گویا میں اس وجہ سے چپ ہو گیا ہوں۔ کہ مجھے مایا
کے مقابلہ میں بھولے سے بہت کم پیار ہے۔ مگر "نہیں" —— میں نے کہا
"آدمی کو ضرور کچھ حوصلہ دکھانا چاہیئے۔"
اس وقت آدھی رات اِدھر تھی اور آدھی اُدھر جب ہمارا پڑوسی
اس حادثہ کی خبر تھانے میں پہنچانے کے لئے جو گاؤں سے دس کوس دور
شہر میں تھا روانہ ہوا۔
باقی ہم سب ہاتھ ملتے ہوئے صبح کا انتظار کرنے لگے: تا کہ دن نکلنے
پر کچھ سجھائی دے۔
دفعتاً دروازہ کھلا۔ اور ہم نے بھولے کے ماموں کو اندر آتے دیکھا۔
اس کی گود میں بھولا تھا۔ اس کے سر پر مٹھائی کی ٹوکریاں اور ایک ہاتھ

میں بتی تھی۔ ہمیں تو گویا تمام دنیا کی دولت مل گئی۔ بابا نے بھائی کو پانی پوچھا نہ خیریت اور اس کی گود سے بھولے کو چھین کر اُسے چومنے لگی۔ تمام اڑدس پڑوس نے مبارک باد دی۔ بھولے کے ماموں نے کہا۔

"مجھے کسی کام کی وجہ سے دیر ہو گئی تھی۔ دیر سے روانہ ہونے پر شب کی تاریکی میں میں اپنا راستہ گم کر بیٹھا تھا۔ یکایک مجھے ایک جانب سے روشنی آتی دکھائی دی۔ میں اس کی جانب بڑھا۔ اس خوفناک تاریکی میں پرس پور سے آنے والی سڑک پر بھولے کو بتی پکڑے ہوئے اور کانٹوں میں اُلجھے ہوئے دیکھ کر میں ششدر رہ گیا۔ میں نے اس کے اس وقت وہاں ہونے کا سبب پوچھا۔ تو اس نے جواب دیا —— کہ باباجی نے آج دوپہر کے وقت مجھے کہانی سنائی تھی۔ اور کہا تھا۔ کہ دن کے وقت کہانی سنانے سے مسافر راستہ بھول جاتے ہیں۔ تم دیر تک نہ آئے تو میں نے یہی جانا۔ کہ تم راستہ بھول گئے ہوگے۔ اور بابا نے کہا تھا کہ اگر کوئی مسافر راستہ بھول گیا۔ تو تم ذمہ وار ہوگے نا —— !!"

همدوش

میں بتی تھی۔ ہمیں تو گویا تمام دنیا کی دولت مل گئی۔ بابا نے بھائی کو پانی پوچھا نہ خیریت اور اس کی گود سے بھولے کو چھین کر اُسے چومنے لگی۔ تمام اڑوس پڑوس نے مبارک باد دی۔ بھولے کے ماموں نے کہا۔

"مجھے کسی کام کی وجہ سے دیر ہو گئی تھی۔ دیر سے روانہ ہونے پر شب کی تاریکی میں میں اپنا راستہ گم کر بیٹھا تھا۔ یکایک مجھے ایک جانب سے روشنی آتی دکھائی دی۔ میں اس کی جانب بڑھا۔ اس خوفناک تاریکی میں پرس پور سے آنے والی سڑک پر بھولے کو بتی پکڑے ہوئے اور کانٹوں میں اُلجھے ہوئے دیکھ کر میں ششدر رہ گیا۔ میں نے اس کے اس وقت وہاں ہونے کا سبب پوچھا۔ تو اس نے جواب دیا —— کہ باباجی نے آج دوپہر کے وقت مجھے کہانی سنائی تھی۔ اور کہا تھا۔ کہ دن کے وقت کہانی سنانے سے مسافر راستہ بھول جاتے ہیں۔ تم دیر تک نہ آئے تو میں نے یہی جانا۔ کہ تم راستہ بھول گئے ہو گے۔ اور بابا نے کہا تھا کہ اگر کوئی مسافر راستہ بھول گیا۔ تو تم ذمہ دار ہو گے نا ——!!"

همدوش

ہمدوش

سطحی نظر سے تو یہی دکھائی دیتا ہے کہ مرکزی شفاخانے کے اُن لوگوں
کو جن کی نگرانی میں بہت سے نااُمید و پُراُمید مریض رہتے ہیں مساوات
پر بہت یقین ہے۔ وہ ہر چھوٹے بڑے کو بلا امتیاز مذہب و ملت تیس
تیس گرہ کے کھلے پائنچوں کا پاجامہ اور کھلے کھلے بازوؤں والی قمیض پہنا
دیتے ہیں۔ جن سے ایک خاص قسم کی سوندھی سوندھی نامانوس سی بُو آتی
ہے۔ قمیض گھٹنے سے بھی چھ گرہ اونچی ہوتی ہے۔ بعض وقت اتنی اونچی
کہ آزار بند بھی دکھائی دینے لگتا ہے۔ مرکزی شفاخانے اور مرکزی زندان
خانے کے مکینوں کی پوشش میں فرق ہی کیا ہے؟ یہی نا کہ شفاخانے
کے مکینوں کی پوشش قدرے مٹیالی رنگت کی مگر اُجلی ہوتی ہے۔
لیکن زندان خانے کے بدنصیب بسنے والوں کی کثیف و سیاہ پوشاک
کو شاید ہی کبھی دھوبی کا منہ دیکھنا نصیب ہوتا ہے۔

شفاخانے میں ان تیس تیس گرہ کے کھلے پائنچوں اور ڈھیلی ڈھالی
قمیضوں میں ڈھکے ہوئے بدن بھی ایک ہی ساخت کے ہوتے ہیں جسمانی
لحاظ سے کوئی قدرے فربہ یا کوئی بہت لاغر ہو تو ہو لیکن منہ پر ایک ہی

سی زردی چھائی ہوتی ہے۔ ایک ہی خوف یا اندیشہ ہوتا ہے۔ جو ہر ایک کے دل میں اضطراب پیدا کیا کرتا ہے ــــــ

"کیا ہم موت کے اس غار پر سے زندہ سلامت گذر جائیں گے؟"

ــــــ اور یہی سوچ ان غریبوں پر راتوں کی نیند حرام کر دیتی ہے۔

سورج ڈوبنے کو ہے۔ شفاخانے کے احاطے کی مرمت طلب دیوار پر ممولے کی مادہ اپنے انڈوں کے خول بنانے کے لئے چونا کریدنے آتی ہے اور اسی وقت انہی تیس تیس گرہ کے کھلے پائنچوں اور ڈھیلی ڈھالی قمیضوں میں بے رنگ و روپ چہروں والے لوگ حکم امتناعی کے باوجود شفاخانے کے احاطے کی مرمت طلب دیوار پر تندرستی کا نظارہ کرنے آتے ہیں۔ اور گھنٹوں حسرت کے عالم میں اُس متحرک زندگی کا تماشا کرتے ہیں۔

شفاخانے کے سامنے ایک بساطی کی دوکان پر چند نوجوان لڑکیوں کا جمگھٹا ہے۔ اُن کی رنگا رنگ ساڑھیوں کے پلے بے باکانہ طور پر سر سے اڑ رہے ہیں۔ کوئی 'ہمانی' کی خریدار ہے اور کوئی 'زینت' کی' اور کوئی 'کوٹی' کی...... دوکان کے اوپر چھت پر پروفیسر کی بیوی حق کے پیچھے اپنے لبوں پر سے لپ سٹک کی اڑی ہوئی سرخی کو درست کرتی ہوئی دھندلی دھندلی سی دکھائی دیتی ہے۔

میرا ساتھی عظیم الدین کھڑا مغلی ــــــ کھڑا مغل کا رہنے والا ــــــ

ہے مغلی پروفیسر کی حسین بیوی کو دیکھ کر ایک لمحے کے لئے اپنے کارٹنکل بلکہ وجود ذنک کے احساس سے بے نیاز ہو کر کہتا ہے۔

"کیا اس کے لبوں پر سے سُرخی اڑ گئی تھی؟"

" دیکھتے نہیں ... ابھی پروفیسر کے کمرے سے باہر آ رہی ہے ..... اور ......"

" ہش ش ... ہش" ـــــ اور ہمارا دوسرا ساتھی انشیچرج لال پھر ہمیں فنا کے عالم میں لے آتا ہے۔

سڑک پر ایک سبز اوپل کار پورے زور سے ہارن بجاتی ہوئی گذرتی ہے۔ اُس میں بیٹھے ہوئے دو بوڑھوں کی نگاہیں تانگہ میں جاتی ہوئی دلہن کی سرخ چوڑیوں میں پیوست ہیں۔ اور دلہن کی نگاہیں سڑک کے کنارے پر پڑے ہوئے کوڑے کرکٹ کے ڈھیر پر جم رہی ہیں۔

چند ایک اوباش چھوکرے اپنے مخصوص بے پروایانہ انداز سے 'ٹپے' گاتے ہوئے سینما کی طرف لپکے جا رہے ہیں۔ اور اُن سے کچھ ہٹ کر سنبھل سنبھل کر چلتے ہوئے ایک سادھو مہاتما ہیں ـــ جن کا ایک ایک قدم شانتی کے تجسس میں اُٹھتا ہے۔ وہ شانتی اور سکون جو کہیں نہیں ملتا ....

شفاخانے کے پھاٹک پر دو خوانچہ والے گتھم گتھا ہو رہے ہیں۔ وہ دونوں بیک ساعت دروازے کے عین بغل میں اپنا خوانچہ رکھنا چاہتے ہیں ...

کمزور نے پیچھے ہٹ کر تنومند کو ایک پتھر مارا ہے . . . .

"ارے اوبے صبر و قناعت لوگو! صحت کی اس تھوڑی سی خوشی سے جو تمہیں عارضاً دی گئی ہے کیوں مستفیض نہیں ہوتے؟ ارے دیکھتے نہیں۔ ہم تمہارے بھائی کتنے حرماں نصیب ہیں؟"

"ہاں بھائی! ــــ یہ سب تندرستی کی باتیں ہیں۔" اشچرج لال کہتا ہے۔ "شاید ہم بھی تندرست ہو کر ایسا ہی کریں"۔

پھر کھیرا مغلی اُس قبرستان کی طرف جو شفا خانے کے قریب واقع ہے۔ دیکھ کر چونک اُٹھتا ہے اور کہتا ہے. . . . .

"کل ہمارے ہی کمرے میں . . . . ساتویں چارپائی . . . . . اف! میرا سر گھوم رہا ہے۔ مجھے یوں دکھائی دیتا ہے۔ جیسے وہ قبرستان ہماری طرف آ رہا ہے . . . ."

"ہش . . . . ش ش . . ." میں اُسے خاموش ہو جانے کے لئے کہتا ہوں۔ "ایسی بات نہ کہو بھائی"۔

لیکن یہ مغلی کے بس کی بات نہیں۔ وہ زور سے چھینکتا ہے۔ کاربنکل کے ساتھ اُسے انفلوئنزا نے بھی آ دبایا ہے۔ اس کے بالکل زرد بے رونق چہرے پر سُرخ نوکدار، رقیق لعاب سے بھری ہوئی ناک ایک عجیب کریہہ منظر پیدا کر رہی ہے۔

لیکن پھر بھی ہمیں تندرستی کی دلچسپ حماقتیں محو کرہی لیتی ہیں۔
حتےٰ کہ پھر مغلی ایک خوفناک انداز سے چھینکتا ہے۔ اور بہت سے آبی ' لعابی ذرات دھوپ کی کرنوں میں اڑنے لگتے ہیں۔ چھینکنے سے مغلی کی ریڑھ کی ہڈی پر زور پڑتا ہے۔ اور وہ درد کے ایک شدید احساس سے کار بنکل پر ہاتھ رکھ لیتا ہے۔ جوں جوں درد کم ہوتا ہے۔ تو اُس کی مڑی ہوئی آنکھیں اور ہمارے رُکے ہوئے سانس آہستہ آہستہ واپس آتے ہیں۔ کچھ دم لینے کے بعد مغلی کہتا ہے۔

"بھائی۔ . . . کیا ہم اِن چوڑے والوں' ان خوانچہ والوں . . . مزدوروں کے ہمدوش چل سکیں گے ؟"

"تم جی میلا نہ کرو مغلی۔ ہیں . . . میرا خیال ہے۔ کہ تم بالکل تندرست ہو جاؤ گے۔ اشٹیچر ج لال پہلے ہی رو بصحت ہے۔ لیکن میں ان لوگوں کے شانہ بشانہ کبھی نہیں چل سکوں گا دیکھتے نہیں میری ٹانگ کو ؟ بالکل گل ہی تو گئی ہے . . . . کاش ! میں اُس گدا کے دوش بدوش چل سکوں مغلی . . . مجھے اِس بات کی پرواہ نہیں۔ چاہے اس کی طرح میری بھی ایک ٹانگ کاٹ لی جائے . . . . میں فقط یہ چاہتا ہوں کہ صحت کی حالت میں اس احاطہ کی دیوار کو پھاند سکوں . . . ."

———— اور یوں اُن تندرست انسانوں کے ہمدوش چلنے

کی ایک زبردست خواہش کو پالتے ہوئے ہم اپنے اپنے کمروں کا رُخ کرتے ہیں۔ اور ممولے کی مادہ جو کہ مٹی کے ایک ڈھیر پر بیٹھی ہمارے چلے جانے کا بڑی ہی بے صبری سے انتظار کر رہی تھی۔ پھر اُسی مرمت طلب دیوار پر اپنے انڈوں کے خول بنانے کے لئے چُونا کریدنے آتی ہے۔

× × × × × × × ×

جب پرندہ پرواز کے لئے پر تولتا ہے۔ اور اپنے پنجے کا پچھلا حصہ زمین پر سے اٹھا کر نشست و پرواز کی درمیانی حالت میں ہوتا ہے۔ اسے 'صُورتِ ناہض' کہتے ہیں۔ بیمار کے لئے صورت ناہض بیٹھنا معیوب اور بدشگونی کی علامت گنا جاتا ہے۔ ہاں! جو اس دنیا میں سے ایڑیاں اٹھا کر فضائے عدم میں پرواز کرنا چاہے۔ وہ بیمار بلا خوف صورت ناہض بیٹھے۔ کھیڑا مغلی اسی طرح بیٹھا تھا۔ میں نے اُسے یوں بیٹھنے سے منع کیا۔ اور ہمیں دروازہ سے "گرٹی" آتے دکھائی دی۔

گرٹی ہماری نرس تھی۔ اس کا پورا نام مس گرٹروڈ بینسن — (MISS GERTRUDE BENSON) تھا۔ مگر ہم میں سے چند ایک دیرینہ مریض اُس سے اتنے مانوس ہو گئے تھے۔ کہ اُسے اُس کے عیسائی نام سے بُلانے سے ذرہ بھر بھی تامل نہیں کرتے تھے۔ اور یہ چھوٹی سی رعایت گرٹی نے خود دے رکھی تھی۔ وہ مجھ پر عموماً اور کھیڑا مغلی پر خصوصاً

مہربان تھی۔ مغلی کی اُجڈ، گنوار، وحرکتیں گرٹی کے لئے باعث تفریح تھیں سُرخ کمبل کو ایک طرف سرکاتے ہوئے وہ اکثر مغلی کے پاس بیٹھ جاتی۔ اور اس کی جھبمی تراش کے بالوں میں اپنی خوبصورت انگلیاں پھیرا کرتی۔ جتنا وہ مغلی کو پیار کرتی، اتنا ہی اُسے وہم ہو جاتا۔ کہ وہ سلامتی سے بعید ہے۔ وہ کہتا۔

"وہ محض میری دلجوئی کے لئے مجھ سے پیار کرتی ہے۔۔۔۔ مریض کو ہر ممکن طریقے سے خوش رکھنا ان کے پیشے کی خصوصیت ہے، اور پھر گرٹی میں جذبۂ رحم بھی تو بہت ہے۔ وہ جانتی ہے۔ کہ میرے دن بہت قریب ہیں۔ اور پھر اس چہرے پر یہ رُوکھا پھیکا تبسم بھی کبھی رقص نہ کریگا۔"

"گرٹی!۔۔۔۔ گرٹی۔۔۔۔" ہم دونوں نے پکارا۔

شفا خانے میں چند ایک مریض ایسے بھی تھے۔ جنہیں کھانا گھر سے منگوا لینے کی اجازت تھی۔ ہم ان خوش نصیبوں میں سے نہیں تھے ہمیں شفا خانے کی طرف سے بیماروں کی خاص خوراک ملتی تھی۔۔۔۔۔۔ وہ خوش نصیب جب کھانا کھا کر چینی کے برتن دور رکھ دیتے اور ان میں سالن کی زردی اور روغن کی چکناہٹ دکھائی دیتی۔ تو ہمارا دل ہمیں بغاوت کے لئے اُکساتا۔

گرٹی کے ہاتھ سے ہم نے کھانا چھینا۔ وہی روزمرہ کا کھانا۔ اگر بھوک

نہ ہوتی تو اس کھانے سے ہمیں رتی بھر بھی رغبت نہیں رہی تھی۔ بہت سے دودھ میں تھوڑا سا ساگودانہ تیرتا ہؤا یوں دکھائی دیتا۔ جیسے برسات کے پانی میں مینڈک کے سینکڑوں انڈے چھوٹے چھوٹے سیاہ داغوں کی صورت میں ایک جھلّی میں لپٹے ہوئے تیرتے نظر آتے ہیں۔

ہم نے قحط زدہ لوگوں کے مخصوص انداز سے ایک ہی رکابی میں کھانا شروع کر دیا۔ اور گرٹی کے کہنے کی مطلق پروانہ کی۔ مریضوں کی تیمارداری کے لئے آئے ہوئے لوگ ہمیں گھورنے لگے۔

"ایک سکھ اور مسلمان . . . ساتھ ساتھ نہیں، ایک ہی رکابی میں!"

—— وہ کیا جانیں۔ کہ شفاخانے کے احاطے کی چاردیوار سے باہر سب کچھ ہے۔ مگر یہاں کوئی ہندو ہے نہ مسلمان، سکھ نہ عیسائی، گوڑ برہمن اور نہ اچھوت . . . یہاں ایک ہی مذہب کے آدمی ہیں۔ جنہیں بیمار کہتے ہیں۔ اور جن کی نجات شفا ہے۔ جس کے حصول کیلئے وہ اپنی تمام خواہشات اور رہی سہی قوت صرف کر ڈالتے ہیں۔

اس دن شام کو ہم نے پھر تندرست انسانوں کی دلچسپ حماقتوں کا تماشا کیا۔ وہی ہنگامے، وہی بے صبری . . . . . . سامنے ایک ڈبل فلائی راؤٹی خیمہ کے نیچے چند ایک آدمی دعوت اڑا رہے تھے۔ ایک کونے میں چند بوتلیں کھلی پڑی تھیں۔ کبھی کبھی سوڈے کی 'بز'،

کی آواز آتی . . . . وہ لوگ ہنستے تھے، چلاتے تھے ۔کیلے اور سنگتروں کے چھلکے ایک دوسرے پر پھینک کر نشانہ بازی کی مشق کرتے تھے۔ اور اس دعوت کی تمام رونق قبرستان کے بے رونق پس منظر کی وجہ سے زیادہ بارونق دکھائی دے رہی تھی۔ بے شک ! زندگی کی بہت سی خوشیاں موت کے پس منظر کی رہینِ منت ہیں ۔جس طرح اخترِ شب کی درخشندگی رات کی سیاہی اور آسمان کے نیلے پن کی۔

کھیڑا مغلی نے یک بیک صورت ناہض سے اُٹھ کر ایک کانپتا ہوا پرُجوش ہاتھ میرے شانہ پر رکھا اور مشکوک انداز سے بولا۔

"بھائی . . . کیا ہم ان لوگوں کے ہمدوش ہو بھی سکیں گے ؟"

میں کچھ دیر مبہوت کھڑا آسمان پر اڑتی ہوئی چنڈولوں کو دیکھتا رہا۔ پھر میں نے مغلی سے لپٹتے ہوتے کہا۔" ہاں . . . مغلی، کیوں نہیں؛ لیکن تم اس طرح بیٹھا مت کرو۔"

پھر کچھ رُک رُک کر میں نے کہا۔

"کل میری ٹانگ کا اپریشن ہے . . . . گرٹی نے مجھے بتایا تھا۔ شاید آج یہ میری اور تمہاری آخری ملاقات ہو۔ تم ان لوگوں کے دوش بدوش چل سکو گے . . . . اشچرج بھی شفا پا جائے گا . . . . . لیکن میں . . . ."

اور ہم دونو چپ ممنداز آنکھوں میں سے ایک دوسرے کو دیکھتے
رہے۔

پھر کھیڑا مغلی نے ایک خوفناک چھینک لی۔

دوسرے دن میری ٹانگ کاٹ لی گئی۔

پانچویں دن میری آنکھ کھلی۔ میں ہل جُل نہیں سکتا تھا۔ میں نے دیکھا۔ کھیڑا مغلی میری پائنتی پر بیٹھا زیرِ لب کچھ ورد کر رہا تھا۔ میری آنکھیں کھُلتے ہوئے دیکھ کر وہ مسکرانے لگا۔ میں نے اپنے بدن میں کچھ طاقت محسوس کرتے ہوئے اُس سے لپٹنے کے لئے کانپتے ہوئے ہاتھ پھیلا دیئے۔ میں اپنی ٹانگ کے دُکھ جانے سے بلبلا اُٹھا۔ اور مغلی اپنے کاربنکل پر زور پڑنے سے!

× × × × × × × ×

مغلی کا کاربنکل اچھا ہو رہا تھا۔ اسی دوران میں مَیں شفا پا کر ہسپتال سے چلا گیا۔ میری غیر حاضری میں میری رفیقِ زندگی فوت ہو چکی تھی۔ اب ایک شیشم کی سخت سی دوہری لاٹھی میری رفیقِ زندگی بن گئی تھی۔ پہلی اور اس رفیق زندگی میں فرق صرف اتنا تھا۔ کہ وہ مجھے اپنی باتونی طبیعت سے نالاں رکھتی۔ اور یہ اپنی خاموشی سے نالاں تر۔

اُسی لاٹھی کو بغل میں دبائے میں آہستہ آہستہ کام پر چلا جاتا۔ مجھے

اپنی ٹانگ کے کاٹے جانے کا چنداں افسوس نہ تھا۔ میں اس بات پر خوش تھا کہ میں تندرست تو ہو گیا اور اپنی خواہش کے مطابق شفاخانے کے احاطے کی دیوار سے باہر۔

ایک وفعہ میں شفاخانے کے پاس سے گذرا تو میری روح تک لرز گئی۔ اس وقت میرے ساتھی اور بعد میں آئے ہوئے مریض حسرت بھری نگاہوں سے ہماری دلچسپ حماقتوں کو دیکھنے میں محو تھے . . . . . اور احاطے کی مرمت طلب دیوار پر تین ممولے اپنی تین کاٹ کی دموں کو تھرتھرا رہے تھے۔ میرے خیال میں بڑا ممولا چھوٹے ممولوں کی ماں تھی جو ہماری بیماری کے ایام میں اُسی دیوار پر اپنے انڈوں کے خول بنانے کے لیئے چُونا کریدنے آیا کرتی تھی۔

اُس وقت میرے سوا اُن مریضوں کی تکلیف کو کون جان سکتا تھا۔ میں نے اُن لوگوں کی مصیبت پر چند ایک آنسو بہائے . . . مجھے سامنے بساطی کی دوکان پر چند نوجوان لڑکیوں کا جمگھٹا دکھائی دیا۔ اُن کی ساڑھیوں کے پلّے اُسی طرح بے باکانہ طور پر سر سے اڑ رہے تھے . . . اور چھت پر اچق کے پیچھے پروفیسر کی بیوی اپنی ساڑھی کی سلوٹوں کو درست کرتی ہوئی دھندلی سی دکھائی دے رہی تھی۔ میں ایک مبہم سے احساس کے ساتھ بساطی کی دوکان کی طرف بڑھا

اور وہاں سے کچھ رنگدار ریشمی فیتے اپنی لاٹھی کو سجانے کے لئے خریدے اور کچھ غیر مطمئن کھویا کھویا اور لڑکھڑاتا ہوا واپس لوٹا۔

ایک دن میں شفاخانے کے اندر گیا۔ تو میں نے دیکھا۔ مغلی کا کاربنکل بہت حد تک ٹھیک ہو چکا تھا۔ ہاں! اشچرج کی حالت نازک اور ناقابل بیان تھی۔ . . . . اسکے بعد مجھے اپنے ایک افسر کے ساتھ چند ہفتوں کے لئے باہر جانا پڑا۔

میرے دل میں کئی بار خیال آیا۔ کھیڑا مغلی مجھے کتنا کوستا ہوگا۔ وہ تو پہلے ہی کہا کرتا تھا۔ کہ انسان خود سکھی ہو کر اپنے گذشتہ دُکھ اور دوسروں کی تکالیف کو عمداً بھول جایا کرتا ہے۔ ہرچند یہ بات درست تھی۔ مگر چند ایک مجبوریوں کی وجہ سے میرے معاملے پر عائد نہیں ہوتی تھی۔

واپس آنے پر ایک فرصت کے دن میں شفاخانے گیا۔

گرٹی نے ایک روکھی پھیکی مسکراہٹ سے میرا استقبال کیا۔ میں ڈر سے سہم گیا۔ اُس نے مجھے بتایا۔ کہ اشچرج لال دو دن ہوئے مکمل شفا پاکر اجمیر چلا گیا ہے۔ مگر گرٹی نے کھیڑا مغلی کی بابت کچھ نہ کہا۔

میں احتیاط سے قدم اٹھاتا ہوا جنرل وارڈ کی طرف گیا۔ برآمدے کے نیچے شفاخانے کے ملازم چند ایک عورتوں اور بچوں کو بلند آواز

سے رونے سے منع کر رہے تھے۔ اُن عورتوں میں سے ایک کھیڑا مغلی کی ضعیف العمر اور نیم مردہ ماں تھی۔ جو اپنے بیٹے کی دائمی مفارقت کے غم میں فلک شگاف چیخیں مار رہی تھی . . . . پھر اُس کی بیوی . . . . . . بچے . . . . .

برآمدے کے ایک طرف مغلی موت کی میٹھی نیند سو رہا تھا۔ اُسے یوں دیکھ کر میری بغل میں سے لاٹھی گر پڑی . . . . میں رو بھی نہ سکا۔

لوگوں نے چپکے سے مغلی کی میّت کو اُٹھایا۔ اُسے کندھوں کے برابر کیا۔ اور کلمہ شہادت پڑھتے ہوئے لے چلے !
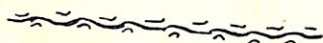
من کی من میں

من کی من میں

مادھو کی بیوی کو لوگ کلکارنی پکارتے تھے۔ اگر میں بہت کچھ چوکتا نہیں تو یہ نام کلتارنی سے ہی بگڑ کر بنا تھا۔ مطلب کُل کی ڈوبتی ہوئی نیّا کو پار لگانے والی۔ یہ پیارا دلارا نام نہ صرف کُل کو لاج لگانے والی سے اختلاف ظاہر کرتا ہے۔ بلکہ اس کا کچھ اور بھی گہرا مطلب ہے۔ جسے مادھو کے سوا کوئی کم ہی جان سکتا ہے۔ عین اس طرح جیسے موسیقی سے فضا میں تموّج کے علاوہ ایک ایسی وجدانی کیفیت پیدا ہوتی ہے جسے کچھ دل ہی سمجھ سکتا ہے۔ اور پھر چوٹ کھایا ہوا دل! . . . . .

سچ تو یہ ہے کہ یہ نام ہوتے ہی کچھ گورکھ دھندا سے ہیں معلوم نہیں لوگ کیوں بعض وقت جنم کے اندھے کو نین سُکھ اور نپٹ گنوار کو ودیا ساگر کہہ دیتے ہیں۔

کئی دفعہ کوئی بھولا بھالا بچہ اچانک اپنی ماں سے سوال کر دیتا ہے کہ میں اس دنیا میں کہاں سے آیا تو ماں گھبرا کر جواب دیتی ہے بیٹا! بڑالی پورنما کے روز اِندر بھگوان نے بہت سا مینہ برسایا۔ ا

وقت بہت سے بچے آکاش سے گرے تھے۔ اُن میں سے ایک تم تھے
مجھے بہت من موہنے لگے اور میں نے تمہیں صحن میں سے اُٹھا لیا۔ یا
کہتی ہے تمہارا باپ ایک سو بیالیس گھنڈیوں والا جال لیکر رام تلائی
یا شاہ بلور کے جوہڑ میں مچھلیاں پکڑنے گیا۔ وہاں نہ مچھلی تھی نہ کچھوا۔
صرف جونکیں تھیں ایک ننھا سا مینڈک عمرو جولاہے کے گھر کے سامنے
روئی کے ایک گالے پر آرام سے بیٹھا ہوا برسات کی خوشی میں گا رہا
تھا۔ وہ تمہیں تھے۔ تمہارا باپ تمہیں اُٹھا لایا اور ہم نے پال لیا۔ کچھ
ایسی ہی بات ہم نے مادھو کے متعلق بھی سنی تھی کہ وہ چکنی مٹی کے ایک
ڈھیلے سے بنا تھا ــــــ ادھر ندیا میں طغیانی آنے پر مٹی کے ایک
ڈھیلے نے رام تلائی کے مندر میں ٹھاکر جی کے چرنوں کو چھوا۔ مٹی پانی
اور ہوا تو پہلے ہی سے موجود تھے۔ آکاش اور آگ ملی تو بچہ بن گیا۔ اور
یہ سب کچھ ٹھاکر جی کی دیا سے ہوا ــــــ گلاب گڑھ کے تمام
پرائمری پاس یا مڈل فیل آدمی اس بات کو ماننے سے صاف انکار کر دیتے
ہیں، بھلا وہ اس بات کا جواب تو دیں کہ سیتا جی کس طرح کھیت میں دبائے
ہوئے ایک گھڑے کو ہل کی ٹھوکر لگ جانے سے پیدا ہو گئیں؟ کرن جی
کس طرح کنتی جی کے کانوں کی میل سے بن گئے؟ رام چندر جی کے دوسرے
بیٹے کُش کو کُشا یعنی گھاس سے کیسے بنا لیا گیا؟

خواہ مادھو مٹی کے ایک ڈھیلے سے بنا تھا۔ پھر بھی اُسے مٹی کا مادھو نہیں کہا جا سکتا تھا۔ کیونکہ وہ ایک بہت سمجھ دار آدمی تھا۔ اگر گھر کے آدمی اُسے مٹی کا مادھو سمجھتے تھے تو سمجھا کرتے گھر میں جو گی کس کو بھایا . . . . گھر والوں کو تو وجہ شکایت یہی تھی نا کہ مادھو گھر کا کام کاج کرنے کی بجائے دوسروں کا کام کر کے زیادہ خوش ہوتا تھا۔ اور حقیقت میں اس بات سے مادھو کی تعریف ہی کا پہلو نکلتا ہے۔

ہاں! کچھ مادھو کی صورت کے متعلق، قد کا گٹھیلا تھا اور جسم کا اکہرا عمر یہی کوئی چالیس پینتالیس کے لگ بھگ ہو گی۔ چہرے پر کئے چیچک کے داغ گورے رنگ سے گھل کھچڑی ہو رہے تھے۔ کلکارنی کی کی آنکھیں تو رسیلی تھیں ہی۔ مگر مادھو کی زیادہ دو ر تک مار کرتی تھیں قدرے باہر کو ابھری ہوئی تھیں . . . . انتی ابھری ہوئی کہ سوتے میں در فتنہ کی طرح ہمیشہ نیم باز رہتیں۔ گلاب گڑھ کے پرائمری سکول کے منشی بھائی گریب داس جو کبھی کبھی شہر میں جا کر ایک آدھ ردی سی فلم کے نظارے سے مستفیض ہو آیا کرتے تھے۔ مادھو کی آنکھوں کو "پیا ملن کی آس" مار کہ آنکھیں کہا کرتے تھے۔ اور اُنکے ہونہار شاگرد اپنے اُستاد کے ارشاد پر تضمین کرتے۔ یا بالکل تجدید کرتے ہوئے مادھو کو "چمگادڑ نینا" کہتے تھے

کلکارنی زندگی کے روشن پہلو اور مادھو تاریک پہلو کو دیکھنے کا عادی تھا۔ دونوں میں ایک دلچسپ مگر خطرناک فطری تضاد تھا۔ اس وجہ سے اکثر اُن کی آپس میں ایک آدھ جھپٹ ہو جایا کرتی۔ مادھو کی قنوطیت اس درجہ نمایاں تھی کہ جو کوئی اُسے بازار میں ملتا تو بجائے جے رام جی کی یا صاحب سلامت کے کہتا۔

"کہو بھئی مادھو —— من کی من میں رہی ؟"

فنا کا نمائندہ اور قنوطیت کا علمبردار فی الفور ایک گہرا ٹھنڈا سانس لیتا اور کہتا۔

"ہاں . . . . بھائی —— من کی من ہی میں رہی !"

اور اس قسم کا طریقۂ تخاطب کلکارنی کو سر سے پاؤں تک جلا دیتا۔ کیا کرتی وہ ؟ گلاب گڑھ کے لوگ تو اُس کی شادی سے پہلے ہی مادھو کو اس کی یاس پسندی کی وجہ سے یوں مخاطب کرنے کے عادی تھے اُنہیں روکنا اُس پودے کو موڑنے کے برابر تھا۔ جو ایک خاصا تن آور درخت بن چکا ہو۔ بہرحال وہ بہت ہی جھلاتی اور جو کوئی مادھو کو یوں مخاطب کرتا۔ اگلے روز اُس کی بیوی، ماں یا بہن سے کلکارنی کی لڑائی ہوتی اور کلکارنی جواب طلب کرتی۔" آخر اس من کی من میں رہی کا مطلب کیا ؟"

مادھو کلکارنی کے اس احتجاج پر بہت خوش ہوتا۔ وفلی بجاتا اور کہتا۔

"میری زندگی کلکارنی کو کتنی پیاری ہے۔ کسی کو من کی من میں رہی کہنے ہی نہیں دیتی۔ حالانکہ نہ اُسے ہنسلی بنوا کر دی ہے۔ اور نہ پازیب . . . . ارے تین مہینے سے تو پیٹ رہی ہے"

ایک دن میں نے مادھو کو یک بیک فلسفی بنتے دیکھا منیشی گریبداس کے سامنے وہ عورت کی محبّت و مروّت کو سراہ رہا تھا —— کنگرو کی قلانچ سے زیادہ عجیب، اجڈ اور دیہاتی انداز میں . . . . اور کون نہیں بھانپ سکتا تھا کہ اس کا اشارہ کلکارنی کی طرف ہے۔ اُس کے لفظ تھے۔

"بھائی گریب داس . . . . . اگر دنیا عورت کی بجائے آدمی کے پیٹ سے پیدا ہونے لگے تو دیا، پریم اور نرمی کا نام ہی نہ رہے۔ عورت آدمی کو اپنی کوکھ سے جنم دے کر اس کے اکھڑپن کو دور کر دیتی ہے"۔

کتنا خفیقت سے لبریز تھا مادھو کا عملی فلسفہ۔ ایسی لاکھوں کی ایک سُنکر بھی جو مادھو کو مٹی کا مادھو کہے۔ کیا وہ خود مٹی کا مادھو نہیں ہے؟"

(۲)

بُرج والے کنوئیں کی بیڑ، چھر کل، ڈھول یا لٹھ ٹوٹتی ٹوٹ جائیگی مگر مادھو اُس کی طرف متوجہ نہ ہوگا۔ بیلوں کی جوڑی سے زیادہ سے زیادہ کام لے کر اور کم سے کم چارہ ڈال کر اس کے مزارعے دو دو سو کے بیلوں کی جوگ کو ایسی ناکارہ بنا دیں گے۔ کہ گلو شاہ کے بھرے میلہ میں اُن کی قیمت پچاس پچاس روپے سے کوڑی نہ بڑھے گی۔ گھر میں کسی خوشی غمی کے موقع پر مادھو سے کسی قسم کی توقع بے کار ہو گی مگر وہ دوسروں کی مدد کے لئے کتنی جلدی لنگر لنگوٹا کسے گا.... گلاب گڑھ میں ایک بیوہ امبو رہتی تھی۔ دُکھیا، اُس کے خاوند کو مرے سات سال کے قریب ہوئے تھے۔ اُسی روز سے بے چاری اپنی عزت کو سنبھالے بیٹھی تھی۔ اگر اُسے سماج کے حال پر چھوڑ دیا جاتا تو بے چاری کبھی کی تباہ و برباد ہو چکی ہوتی۔ مادھو کو اس کی مدد کرتا دیکھ کر لوگ کئی طرح کے بہتان تراشتے۔ طرح طرح کی باتیں بنا کر معصوم مادھو اور بدنصیب بیوہ کو بدنام کرتے۔ سماج میں اتنی دیا کہاں کہ جس چیز کو وہ خود دینے سے ہچکچاتی ہے۔ اپنے کسی فرد کو دیتا دیکھے۔ امبو کی مدد پر لوگوں کی مخالفت نے دونوں کی زندگی اجیرن کر دی تھی۔ اور اس مخالفت

میں کلکارنی سب کی پیشوائی کرتی تھی۔

اگر یہ سچ ہے کہ کسی غیر مرد کا یوں بیوہ کی مدد کرنا پاپ ہے تو اسی طرح یہ بھی سچ ہے کہ سماج کے دائرہ میں رکھ کر ایسی شکستہ حال بیوہ کے رہے سہے گوشت و پوست کو نوچ نوچ کر کھانا کوئی پاپ نہیں!

ایک دن مادھو کہیں باہر سے آیا۔ وہ چہرے سے کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا دکھائی دیتا تھا۔

"مجھے بیس روپے دوگی ——— کارنی؟" مادھو نے گاڑھے کی چادر کو شانے پر ڈالتے ہوئے کہا۔

"کیا کروگے اتنے روپوں کو؟"

مادھو کو اسی سوال کی توقع تھی۔ کارنی کو اس بات کا وہم رہتا تھا کہ مادھو اپنی پُر سخاوت طبیعت کی وجہ سے جا و بے جا روپیہ خرچ کرتا رہتا ہے۔ اور اس کا عقیدہ تھا کہ جو آپ کھایا سو کھایا جو کھلایا سو گنوایا وہ روپیہ جمع بھی کرتی تو اس لئے کہ زندگی میں کبھی کام آئے گا۔ گویا وہ ہمیشہ جیتی ہی رہے گی ——— اتنی لمبی آس ——— اور شرادھ میں گئے گذروں کے نام پر وہ بہت سا روپیہ دان بھی کرتی مگر اس قسم کے دان سے مادھو متفق نہیں تھا۔

"کیا کروگے ان روپوں کو؟" اس سوال کا جواب مادھو نے

پہلے ہی سے اپنے ذہن میں تراش رکھا تھا۔ فوراً بولا۔

"چند دن ہی ہوئے تُو خود ہی ہنسلی اور پازیب کے لئے کہہ رہی تھی . . . میں باہر جا رہا ہوں۔ بنوا لاؤں گا"

کلکارنی اچھل پڑی۔ بھلا ہنسلی اور پازیب کیلئے کون بیس روپے نہ دے گا۔ وہ فوراً گندم کے ڈھیر میں چھپائی ہوئی بانسلی اٹھا لائی۔ اور بیس روپے کے بچیس مادھو کی کمر میں بندھوا دیئے اور بولی۔

"سنو، کل سگرانت ہے . . . مکر سگرانت، تمہارے بہو بیٹے کا پہلا تیوہار ہو گا۔ ہو سکے تو سُنار کے پاس ہی بیٹھ کر ہنسلی ڈھلوا لینا نہیں تو اس کے عوض کوئی اور ہی لے آنا . . . . پل کی پل پہن لونگی۔ جلدی آنا میں نے تیوہار منانے کا بندوبست کر لیا ہے"

مادھو نے کمر میں بندھی ہوئی بانسلی پر ایک چُست سی جھرجھری ڈالی اور چل دیا۔

سگرانت بھی آ گئی۔ اس دن سورج دھن راسی سے نکل کر مکر راسی میں داخل ہوتا ہے۔ اس لئے اسے مکر سگرانت کہتے ہیں۔ سگرانت کی دیوی نے سوائے مادھو کے پاپ کے گلاب گڑھ تو کیا تمام دُنیا میں سے پاپ کی بیخ کنی کے لئے اپنی بڑی بڑی آنکھوں کو پھیلا اور ترشول تان کر دنیا کا سفر کرنا شروع کر دیا تھا۔ سبھی دیہی عورتیں تِل

گڑ، بیر، امرود اور گندیریاں بانٹ رہی تھیں۔ پریم کے اس تبادلے کو اُدتی بھرن کہتے ہیں اودتی، بھرن کرتے ہوئے وہ غیر ارادی طور پر ہماری زندگی میں ایک روح پھونک دینے والا پیغام دے رہی تھیں۔ دراز سے دراز اور سیاہ سے سیاہ زبان رکھنے والی عورت بھی اپنے چہرے کو ایک عارضی مسکراہٹ سے مزین کرتے ہوئے کہہ رہی تھی "میٹھا میٹھا کھاؤ اور میٹھا میٹھا بولو۔"

چونکہ مادھو کے بہو بیٹے کا پہلا تیوہار تھا۔ دونوں کو صحن کے وسط میں ایک دھوتی اور ایک لنگوٹی بندھوا کر بیٹھا دیا گیا جسم پر تیل اور دہی ملا گیا۔ اس کے بعد بہو کی بہن نے بہو کو اور دولہا کی بہن نے دولہا کو سہیلے گاتے ہوئے نہلایا۔ پھر انہیں خوبصورت کپڑے پہنائے گئے۔ صحن کے ایک کونے میں بیٹھے ہوئے آدمیوں نے چند پرانے سے ناقوس اور نفیریاں بجائیں۔ دف پر چوٹ پڑی، کلکارنی نے سبیند ور، مصری اور ناریل بانٹا۔ اُس وقت مادھو کا بدھائی لینے کے لئے وہاں ہونا لازمی تھا۔ مگر وہ کہیں دکھائی نہ دیتا تھا۔ کلکارنی کو تو اپنی ہنسلی اور پازیب کی پڑی تھی۔ وہ رہ رہ کر مادھو کو کوستی اور اپنے گلے اور ایڑیوں کو ساڑھی کے پلوؤں سے چھپاتی . . . . .
کلکارنی جان گئی کہ سنار نے ہنسلی بناتے ہوئے دیر لگا دی ہوگی۔

کبھی کبھی اُسے خیال آتا۔ شاید مادھو میری زیادتیوں کی وجہ سے مجھ سے روٹھ گیا ہو۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ مکر سگرانت کے دن روٹھے منائے جاتے ہیں۔ مگر سیدھا سادا مادھو اتنے چھل بل کہاں جان سکتا تھا ——— سنار کے پاس آدمی دوڑایا گیا تو پتہ چلا کر مادھو وہاں پہنچا ہی نہیں۔

مادھو کی ڈھنڈیا پڑی۔ کوئی بچہ تھوڑے ہی تھا کہ راستہ بھول جاتا کلکارنی کی تشویش بڑھی۔ اُس نے چاروں طرف آدمی بھیجے۔ اس بات میں شک نہیں کہ مادھو نے گھر کلی طور پر کلکارنی سی ہوشیار عورت کو سونپ رکھا تھا۔ مگر اتنا بے مہر نہیں تھا کہ اپنے بہو بیٹے کے پہلے تیوہار کے شگن منانے سے احتراز کرتا۔

شام تک نہ مادھو پہنچا اور نہ کلکارنی کی ہنسلی اور پازیب۔ کلکارنی کا غصہ اور فکر دونوں سُرعت سے بڑھنے لگے۔

جب شام کو دیوں کو دیا سلائی دکھائی گئی تو عورتیں سب کی سب ایک ایک کر کے رخصت ہوگئیں۔ پہلے شور و غوغا سے آشنا کان برابر کی خاموشی کو پا کر سائیں سائیں کرنے لگے۔ اس وقت کلکارنی کے کانوں میں ایک دھیمی سی آواز آئی۔ اس کا پڑوسی بنجارہ کہہ رہا تھا۔ . . . .

"کہو بھائی۔ . . . مادھو! من کی من میں رہی ؟"

جواب میں ایک مردہ سی آواز آئی۔ "ہاں بھائی! من کی من ہی میں رہی!"

اب تک تو کلکارنی کا فکر اُس کے غصہ پر غالب تھا۔ اب مادھو کو بے آنچ پہنچتے اور پھر برس کے برس۔ دن من کی من ہی میں رہی اگے الفاظ کہتے سن کر اس کا غصہ فکر پر غالب آگیا۔ وہ سر سے پاؤں تک راکھ ہی تو ہوگئی بجلی کی مانند لپکی۔ صحن میں آئی۔ ڈیوڑھی میں پہنچکر دروازے کی زنجیر اندر سے چڑھا دی۔ ننگی ایڑیوں کو دیکھ کر اس کا غصہ اور بھی چمک اٹھا۔ اس اثنا میں مادھو دروازے کے قریب پہنچ چکا تھا اور سردی سے کانپ رہا تھا۔ پوہ ماگھ کی سردی جگہ تک پہنچتی ہے۔ کانپتے ہوئے مادھو نے کلکارنی سے دروازہ کھولنے کے لئے منت کی۔

اندر سے آواز آئی"۔ جاؤ ـــــ باہر ہی رہو۔ اب تمہاری ضرورت ہی کیا ہے؟ جدھر منہ اُٹھائے ہو اُدھر چلے جاؤ ـــــ اُتر ہے تو اتر کو دکھن ہے تو دکھن کو۔ . . . . گھر کیا ہے ہنسی کھیل بنا رکھا ہے۔ بڑی سونٹھ کی جڑھ تلاش کرنے گئے تھے۔ . . . یہ بھی نہیں سوجھتی گھر میں خوشی ہے . . . . پرمیشر نے چاہا تو یہ من کی من میں ہی رہے گی . . . . واویلا کیوں کرتے ہو؟"

مادھو کچھ دیر کے لئے ٹھٹک گیا۔ پھر بولا" دروازہ تو کھولو ـــــ کارنی، دیکھو سردی کے مارے اکڑ رہا ہوں۔ تمہاری ہنسلی اور پازیب ہی تو بنوانے گیا تھا۔"

"میں جانتی ہوں۔ تمہاری تو پرچھائیں تک سُنار کے پاس نہیں پھٹکی ... سچ سچ کہو کیا تم اُس میری سوت کے پاس نہیں گئے تھے۔؟"

"کون سوت؟"

"امبو ـــــ اور میری سوت کون ہوگی؟"

حقیقت میں مادھو اسی کے پاس گیا تھا۔ کلکارنی کے سامنے اس بات سے انکار کرنے کی اُسے جرأت نہ پڑی۔ اور وہ انکار کرتا بھی کیوں؟ بولا ـــــ

"ٹھیک ہے کارنی ـــــ امبو بہن نے کہلا بھیجا تھا۔ ساہوکار نے ایک ایک روپے کے دو دو اور دو دو کے تین تین بنا لئے ہیں ... اور ہم نے بیس روپے تم سے در اصل اسی لئے مانگے تھے۔ تمہاری ہنسلی میں اپنے پیسوں سے بنوا دوں گا۔ جو ڈاک گھر میں جمع ہیں۔ فکر نہ کرو۔ دروازہ تو کھولو۔"

مادھو کو کوئی جواب نہ ملا۔ کلکارنی کے بڑبڑانے کی آواز آئی۔ وہ کہہ رہی تھی۔

"برس دن بعد ایک آدھ دن خوشی کا آتا ہے ...... اُس میں بھی دُکھ ہی ملتا ہے ...... بہو بیٹے کا تہوار روز روز آئیگا نا ..... بسیلے روز روز گائے جائیں گے نا ...... ایسے موقع پر خوشی کو دبا کر کون دِق مول لے ...... یہ ہیں کہ ..."

مادھو نے ٹھنڈی سانس بھری اور کہا۔

"کسی بہن بھائی کو دکھی دیکھ کر مجھ سے نو مدن اور رتی کے سہیلے
نہ گائے جاتے ہیں نہ گائے جائیں گے!"

کلکارنی نے دروازہ نہ کھولا . . . .

مگر اُسے نیند کہاں آتی تھی۔ ایک ڈیڑھ گھنٹہ کے بعد اُس نے
آہستہ سے کواڑ کھولے تو دیکھا۔ اس کا مجازی خدا دروازہ کی چوکھٹ پر
سر ٹیک کر اونگھ گیا تھا۔ اس کے گھٹنے چھاتی سے لگ رہے تھے۔ کلکارنی
کی آنکھوں سے آنسو ٹپ ٹپ گرنے لگے۔ شرمندگی کے ایک گہرے احساس
سے اُس نے مادھو کا شانہ ہلایا۔ بولی۔

"میں کہتی ہوں . . . ."

". . . . . ."

"جی میں کہتی ہوں . . . . چلو گے؟ اندر . . . !"

مادھو نے آنکھیں ملتے ہوئے سر اُٹھایا۔ اور بولا "ہاں . . . چلونگا!"

مادھو اندھیرے میں اپنے ہاتھوں کو دیکھنے لگا۔ سردی میں ہاتھ
سُن ہو رہے تھے۔ یوں گمان ہوتا تھا۔ جیسے وہ اُسکے اپنے نہیں ہیں۔
کلکارنی نے جلدی سے انگیٹھی جلائی۔ مادھو کے اکڑے ہوئے جسم کو گرم
کیا اور اُس کے پاؤں پر سر رکھ کر دیر تک روتی رہی —— اور یہ تو نا دھونا

کاہے کا۔۔۔ مادھو کو تو ذرا بھی غصہ نہیں تھا!

نصف شب کے قریب مادھو کو چھاتی میں کچھ درد محسوس ہوا۔ باقی رات وہ چھاتی کو دباتا اور کراہتا رہا۔ کلکارنی نے گھی گرم کرکے جائفل کوٹ کر مالش بھی کی۔ مگر مادھو کا دُکھ بڑھتا گیا۔

صبح ہوتے ہوتے اُس کی تکلیف بہت ہی بڑھ گئی۔ وہ ور نزدیک سے سیانے لائے گئے۔ مادھو کو نمونیا ہو گیا تھا۔ اُس کے دونوں پھیپھڑے شل ہو گئے تھے۔ سانس مشکل سے آتی تھی۔ کارنی کہتی تھی کہ نمونیا وغیرہ کچھ نہیں۔ امبو بہت گنڈے تعویذ جانتی ہے۔ اس نے کچھ نہ کچھ دیدیا ہوگا۔ اگر وہ گذشتہ شب کے واقعہ کو نگاہ میں رکھتے ہوئے اپنا قصور مان لیتی تو وہ دیوی سے کم کیا ہوتی۔ مگر وہ تو محض ایک عورت تھی!

ایک پہر بعد مادھو کو کچھ افاقہ ہوا۔ اُس نے کارنی کو بلایا اور بولا۔ "میں نے سُنا ہے۔۔۔۔۔ کہ تم نے امبو کو اندر تک نہ آنے دیا۔ صبح جب وہ میری خبر لینے کے لئے آئی تھی۔۔۔ کیوں؟"

"نہ جانے کیوں۔"

"تم جانتی ہو میں امبو بہن سے بہت پیار کرتا ہوں۔۔۔"

"ہاں۔۔۔ مگر میں جگ ہنسائی نہیں چاہتی۔ تمام دنیا میرے پیچھے کتے لگائے گی۔۔۔ جانتے بھی ہو دنیا کو؟۔۔"

"جانے دو دنیا کو" مادھو نے بائیں پھیپھڑے میں درد کی ایک ٹیس محسوس کرتے ہوئے کہا۔" اب جبکہ میں مر رہا ہوں۔ مجھے دنیا کی پرواہی کیا ہے.... میرے پاس تو اتنے بول بھی نہیں کہ میں امبو بہن اور اس کے ساتھ اپنے رشتہ کی پاکیزگی کا دعوےٰ کر سکوں... ہائے...... تم اپنے مرتے ہوئے بھائی کو بچن دو کہ تم اپنی زندگی میں اُس غریب کی ایسے ہی خبرداری کرتی رہو گی..... اُسے اپنے پاس بلا لو گی... کہو تو..."

"میری خبرگیری کون کرے گا؟..... تمہارے دشمنوں کو...."

کلکارنی زار و قطار روتے ہوئے بولی۔

مادھو نے آسمان کی طرف انگلی اٹھائی۔

مادھو دنیا کو چھوڑ رہا تھا۔ مگر کارنی دُنیا سے چمٹی ہوئی تھی۔ اُس نے تو مادھو کو خالی تسکین دینے کے لئے بھی اثبات میں سر نہ ہلایا۔ وہ بالکل اُس آدمی کی طرح تڑپتا رہا۔ جس کے دل میں بہت سی خواہشیں ہوں۔ مگر موت اُس کا گلا آدبائے..... کچھ دیر بعد مادھو کا درد ہمیشہ کے لئے مٹ گیا۔

مرنے کے بعد مرحوم کی جو آخری باتیں نمایاں طور پر یاد آتی ہیں۔ اُن میں سے ایک یہ تھی۔" کسی بھائی بہن کو دکھی دیکھ کر مجھ سے مدن اور رنی کے ہبیلے نہ گائے جاتے ہیں۔ نہ گائے جائیں گے"!

(۳۲)

ہمارے ملک میں تہوار تہوار ہی تو ہیں۔ اور رہتی کیا ؟ کاش یہاں کوئی تہوار نہ ہوتا۔ رانڈیں اور یتیم تو رونے سے بچ جاتے۔ پھر ایک بار مکر سنگرانت آگئی۔ پھر سورج دھن راسی سے مکر راسی میں داخل ہوا۔ سنگرانت کی دیوی نے سماج کے کلنک یعنی امبو کے پاپ کے سوا تمام دنیا میں سے پاپ کی بیج کنی کے لئے اپنی بڑی بڑی ڈراؤنی آنکھوں کو پھیلا اور ترشول تان کر دنیا کا سفر کرنا شروع کر دیا تھا۔ اوٹی بھرن کرتے ہوئے درانتی سے دراز اور سیاہ سے سیاہ زبان رکھنے والی عورت بھی اپنے چہرے کو ایک عارضی مسکراہٹ سے مزین کرتی ہوئی کہہ رہی تھی۔ "میٹھا میٹھا کھاؤ اور میٹھا میٹھا بولو۔"

پھر موقع آیا کہ برسوں کے روٹھے ہوئے منائے جائیں۔ امبو سے تو گاؤں کا ہر ایک بچہ بوڑھا روٹھ گیا تھا۔ وہ کس کس کو مناتی۔ ایک رُلیا اور مادھو کے روٹھ جانے سے کائنات کا ذرہ ذرہ اُس سے روٹھ گیا تھا۔ ہائے! رُلیا اور مادھو ایسے روٹھنے والے کوئی ماننے کے لئے تھوڑے ہی روٹھے تھے۔!

*

امبو کے گھر میں کانسی کے چمکتے ہوئے برتن بالکل سونے کے بنے

ہوئے دکھائی دیتے تھے۔ جھونپڑی میں لیپ پوت یوں کیا گیا تھا جیسے امبو کے گھر میں کوئی آنے والا ہو۔ کبھی کبھی وہ آنکھ اُٹھا کر باہر دیکھ لیتی۔ کیا عجب جو کہیں گھومتا پھرتا رلیا ہی آجائے۔ نہیں تو مادھو کی صورت ہی دکھائی دے جائے۔

مادھو کے بیٹے میں امبو کو مادھو بھائی کی ہی روح نظر آتی تھی۔ اگرچہ وہ جانتی تھی کہ گاؤں کے لوگ عام طور پر اور کلکارنی اور اس کی بہو بیٹا خاص طور پر اُس کی شکل دیکھنے سے بیزار ہیں۔ کیونکہ اُسی نے تو مادھو کو کوئی جنتر منتر دے دیا تھا۔ پھر بھی اُس نے ایک کانسی کی تھالی میں کچھ گاجریں، مٹر، امرود، بیر اور گنڈیریاں وغیرہ رکھیں۔ تاکہ مادھو کی بہو کو دے آئے۔ اپنی پھٹی ہوئی ساڑھی کے ایک پلو سے اُس نے تھالی کو ڈھانپا اور مادھو کے گھر چلی۔

امبو کی ہمت نہ پڑتی تھی کہ وہ دہلیز کے اندر قدم رکھے۔ ایک برس پہلے لوگوں کی مخالفت کے باوجود اس کی اس گھر میں پوچھ ہوتی تھی آج وہ اس گھر میں کون تھی۔ ایک عورت نے اُسے اندر آتے ہوئے دیکھکر کہا "لو بہن ——— وہ رہی تمہاری سوت"۔

کلکارنی اُسے دیکھ کر جل بھن گئی۔ آہستہ سے بولی "مرتی بھی نہیں کمبخت . . . . مرے تو میں آٹے میں لوبان اور گھی رینددھوں . . . . دودھ

کا کٹورا پیئوں . . . گنگا نہاؤں ۔ نہ جانے کیا کیا کروں "
جب امبو بالکل نزدیک آگئی تو کلکارنی اپنے چہرے کو ایک عارضی مسکراہٹ سے مزین کرتی ہوئی بولی ۔
" آؤ بہن ! . . . میٹھا میٹھا کھاؤ اور میٹھا میٹھا بولو ! "
امبو نے اُن دونوں کی باتیں تھوڑی بہت سن لی تھیں ۔ سوت کا لفظ کان میں پڑتے ہی اُس کا تمام جسم کانپنے لگا ۔ بے ساختہ اُسکی زبان سے نکلا " بھیا کہاں ہیں ؟ "
دوسری عورتیں مسکرانے لگیں ۔
پچھلے سال ٹھیک اسی دن مادھو اس سے آخری بار ملنے گیا تھا ۔ اس بات کو یاد کرتے ہوئے امبو کا دل مسلا گیا ۔ کلکارنی ایک کونے میں میٹھی ہوئی تھی ۔ اُسے بھی پچھلی سگرانت یاد آگئی ۔ ٹھیک اسی دن امبو نے مادھو کا کلیجہ نکال لیا تھا ۔ مگر وہ اس سگرانت کی رات کا واقعہ بالکل بھول گئی تھی ۔ صرف اُسے مادھو کے وہ الفاظ یاد تھے " کسی بہن بھائی کو دکھی دیکھ کر مجھ سے مدن اور رتی کے سہیلے نہ گائے جاتے ہیں نہ گائے جائیں گے "
تمام عورتیں ہنسی کھیلتی رہیں ۔ پھر اوٹی بھرن کیا گیا ۔ سہاگنوں نے ایک دوسری کی مانگ میں سیندور لگایا ۔ جب کلکارنی کی بہو کی مانگ میں پڑوس کی ایک دلہن نے سیندور لگایا تو امبو وہیں کھڑی رہی ۔

سہاگن کے پاس بیوہ کھڑی رہے۔ رام رام!۔۔۔ کارنی نے امبو کو بازو سے پکڑا اور دھکا دے کر برآمدے سے باہر کر دیا۔ بولی۔

"دیکھتی نہیں کیا ہو رہا ہے۔۔۔؟"

امبو نے چاروں طرف دیکھا۔ کہ کوئی اس کی طرف تو نہیں دیکھ رہا مگر سب کی نظریں اسی کی طرف تھیں۔ امبو نے منہ چھپا کر رونا چاہا۔ مگر وہ رو بھی تو نہ سکتی تھی۔ برس کا برس دن اور رونا! کارنی جان ہی تو نکال لے گی! مگر رونا برس کے برس روز اور عام دن میں کوئی بھی تمیز نہیں کرتا۔ وہ آپ ہی آپ آجاتا ہے۔ بلکہ یتیم اور بیوہ کو رونا برس کے برس دن ہی تو آتا ہے۔ اسی دن مرے ہوئے بالکل نزدیک آجاتے ہیں۔ ساتھ ہی اٹھتے ہیں ـــ ساتھ ہی بیٹھتے ہیں ہنسو تو ہنستے ہیں۔ رو و تو روتے ہیں۔ اور گلے مل مل کر روتے ہیں۔ کوئی انہیں دیکھتا ہے کوئی نہیں دیکھتا!

پڑوس کی بنجارن امبو کے پاس سے گذری اور محض امبو کو سنانے کی غرض سے گنگنانے لگی ـــ "پتی برتا کا ایک ہے وبھچارن کے دوئے!"

ـــ اور پھر سگرانت کے شور و غوغا میں شامل ہوتے ہوئے بولی۔۔ "میٹھا میٹھا کھاؤ اور میٹھا میٹھا بولو!"

امبو کو زمین میں جگہ نہیں ملتی تھی کہ اس میں سما جائے۔ اس گومگو

کی حالت میں کلکارنی نے اُسے دھکے دے کر باہر نکال دیا۔ وہ محض دنیا سے چمٹی ہوئی تھی۔ اور مادھو کے آخری الفاظ کا اُسے کوئی خیال نہ تھا

اگلی صبح لوگ کہہ رہے تھے۔ "نہ جانے امبو کہاں چلی گئی۔"

سماج کے ماتھے پر سے اس کلنک کو کلکارنی نے ہی تو دھویا تھا لوگ اُس سے خوش تھے۔ اور جب وہ بہت خوش ہوکر عقیدت سے کہتے۔ "بھئی کلکارنی نے اپنے نام کی لاج رکھ لی۔" تو سوکھا سا منہ بنا کر بھائی گریب داس ایک ٹھنڈا سانس لیتا اور کہتا۔

"——— آہ! مگر غریب مادھو کے من کی من ہی میں رہی!"

گرم کوٹ

گرم کوٹ

میں نے دیکھا ہے معراج الدین ٹیلر ماسٹر کی دوکان پر بہت سے عمدہ عمدہ سوٹ آویزاں ہوتے ہیں۔ انہیں دیکھ کر اکثر میرے دل میں خیال پیدا ہوتا ہے کہ میرا اپنا گرم کوٹ بالکل پھٹ گیا ہے۔ اور اس سال ہاتھ تنگ ہونے کے باوجود مجھے ایک نیا گرم کوٹ ضرور سلوا لینا چاہیئے ٹیلر ماسٹر کی دکان کے سامنے سے گذرنے یا اپنے محکمہ کی تفریح کلب میں جانے سے گریز کروں تو ممکن ہے مجھے گرم کوٹ کا خیال بھی نہ آئے کیونکہ کلب میں جب سنتا سنگھ اور یزدانی کے کوٹوں کے نفیس ورسٹڈ (WORZTED) میرے سمند تخیل پہ تازیانہ لگاتے ہیں تو میں اپنے کوٹ کی بوسیدگی کو شدید طور پر محسوس کرنے لگ جاتا ہوں۔ یعنی وہ پہلے سے کہیں زیادہ پھٹ گیا ہے۔

بیوی بچوں کو پیٹ بھر روٹی کھلانے کے لئے مجھ سے معمولی کلرک کو اپنی بہت سی ضروریات ترک کرنی پڑتی ہیں۔ اور انہیں جگر تک پہنچتی ہوئی سردی سے بچانے کے لئے خود موٹا جھوٹا پہننا پڑتا ہے ..... یہ گرم کوٹ میں نے پارسال دہلی دروازے سے باہر پرانے کوٹوں کی

ایک دکان سے مول لیا تھا۔ کوٹوں کے سوداگر نے پرانے کوٹوں کی سینکڑوں گانٹھیں کسی مرانجا، مرانجا اینڈ کمپنی کراچی سے منگوائی تھیں۔ میرے کوٹ میں نقلی ساٹن کے استر سے بنی ہوئی اندرونی جیب کے نیچے مرانجا، مرانجا اینڈ کو کا لیبل لگا ہوا تھا۔ مگر کوٹ مجھے ملا بہت سستا۔ مہنگا روئے ایک بار سستا روئے بار بار . . . . اور میرا کوٹ ہمیشہ ہی پھٹا رہتا تھا۔

اسی دسمبر کی ایک شام کو تفریح کلب سے واپس آنے پر میں ارادتاً انارکلی میں سے گذرا۔ اس وقت میری جیب میں دس روپے کا نوٹ تھا۔ آٹا دال، ایندھن، بجلی، بیمہ کمپنی کے بل چکا دینے پر میرے پاس وہی دس کا نوٹ بچ رہا تھا . . . . . . جیب میں دام ہوں تو انارکلی میں سے گذرنا معیوب نہیں۔ اُس وقت اپنے آپ پر غصہ بھی نہیں آتا۔ بلکہ اپنی ذات کچھ بھلی بھلی معلوم ہوتی ہے۔ اس وقت انارکلی میں چاروں طرف سوٹ ہی سوٹ نظر آرہے تھے اور ساڑھیاں، چند سال سے ہر نتھو خیرا سوٹ پہننے لگا ہے . . . . میں نے سُنا ہے گذشتہ چند سال میں کئی ٹن سونا ہمارے ملک سے باہر چلا گیا ہے . . . . . . شاید اسی لئے لوگ جسمانی زیبائش کا خیال بھی بہت زیادہ رکھتے ہیں۔ نئے نئے سوٹ پہننا۔ اور خوب ٹھاٹ سے رہنا ہمارے افلاس کا بدیہی ثبوت ہے۔ ورنہ

جو لوگ سچ مچ امیر ہیں۔ ایسی شان شوکت اور ظاہری تکلفات کی چنداں پروا نہیں کرتے۔

کپڑے کی دکان میں ورسٹڈ کے تھانوں کے تھان کھلے پڑے تھے۔ انہیں دیکھتے ہوئے میں نے کہا۔ کیا میں اس مہینے کے بچے ہوئے دس روپوں میں سے کوٹ کا کپڑا خرید کر بیوی بچوں کو بھوکا ماروں؟ لیکن کچھ عرصہ کے بعد میرے دل میں نئے کوٹ کے ناپاک خیال کا ردِ عمل شروع ہوا۔ میں اپنے پرانے گرم کوٹ کا بٹن پکڑ کر اُسے بل دینے لگا۔ چونکہ تیز تیز چلنے سے میرے جسم میں حرارت آگئی تھی۔ اس لئے موسم کی سردی اور اس قسم کے خارجی اثرات میرے کوٹ خریدنے کے ارادے کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے سے قاصر رہے۔ مجھے تو اس وقت اپنا وہ کوٹ بھی سراسر تکلف نظر آنے لگا۔

ایسا کیوں ہوا؟ میں نے کہا ہے جو شخص حقیقتاً امیر ہوں وہ ظاہری شان کی چنداں فکر نہیں کرتے۔ جو لوگ سچ مچ امیر ہوں۔ انہیں تو پھٹا ہوا کوٹ بلکہ قمیص بھی تکلف میں داخل سمجھنی چاہیئے تو کیا میں سچ مچ امیر تھا کہ . . . . . . ؟

میں نے گھبرا کر ذاتی تجزیہ چھوڑ دیا اور بمشکل دس کا نوٹ صحیح سلامت لئے گھر پہنچ گیا۔

شمی، میری بیوی، میری منتظر تھی۔

آٹا گوندھتے ہوئے اُس نے آگ پھونکنی شروع کر دی ـــــ

کم بخت منگل سنگھ نے اس دفعہ لکڑیاں گیلی بھیجی تھیں۔ آگ جلنے کا نام ہی نہیں لیتی تھی۔ زیادہ پھونکیں مارنے سے گیلی لکڑیوں میں سے اور بھی زیادہ دھواں اُٹھا۔ شمی کی آنکھیں لال انگارہ ہو گئیں۔ اُن سے پانی بہنے لگا۔

"کم بخت کہیں کا ۔ ۔ ۔ منگل سنگھ" میں نے کہا "ان پُرنم آنکھوں کے لئے منگل سنگھ تو کیا میں تمام دنیا سے جنگ کرنے پر آمادہ ہوں ..."

بہت تگ و دو کے بعد لکڑیاں آہستہ آہستہ چٹخنے لگیں۔ آخر ان پُرنم آنکھوں کے پانی نے میرے غصّے کی آگ بجھا دی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ شمی نے میرے شانہ پر سر رکھا اور میرے پھٹے ہوئے گرم کوٹ میں پتلی پتلی انگلیاں داخل کرتی ہوئی بولی۔

"اب تو یہ بالکل کام کا نہیں رہا"

میں نے دھیمی سی آواز سے کہا "ہاں"

"سی دوں؟ ۔ ۔ ۔ یہاں سے ۔ ۔ ۔"

"سی دو۔ اگر کوئی ایک آدھ تار نکال کر رفو کر دو تو کیا کہنے ہیں"

کوٹ کو الٹتے ہوئے شمی بولی "استر کو تو موٹی ٹڈیاں چاٹ رہی

ہیں . . . . نقلی ریشم کا ہے نا . . . یہ دیکھئے۔"

میں نے شمی سے اپنا کوٹ چھین لیا۔ اور کہا" مشین کے پاس بیٹھنے کی بجائے تم میرے پاس بیٹھو، شمی . . . . . . دیکھتی نہیں ہو دفتر سے آرہا ہوں . . . . یہ کام تم اُس وقت کر لینا جب میں سو جاؤں"

شمی مسکرانے لگی۔

وہ شمی کی مسکراہٹ اور میرا پھٹا ہوا کوٹ !

شمی نے کوٹ کو خود ہی ایک طرف رکھ دیا۔ بولی "میں خود بھی اس کوٹ کی مرمت کرتے کرتے تھک گئی ہوں . . . . . . اسے مرمت کرنے میں اُس گیلے ایندھن کو جلانے کی طرح جان مارنی پڑتی ہے . . . . آنکھیں دُکھنے لگتی ہیں . . . . . آخر آپ اپنے کوٹ کے لئے کپڑا کیوں نہیں خریدتے ؟"

میں کچھ دیر سوچتا رہا۔

یوں تو میں اپنے کوٹ کے لئے کپڑا خریدنا گناہ خیال کرتا تھا مگر شمی کی آنکھیں ! . . . . اُن آنکھوں کو تکلیف سے بچانے کے لئے میں منگل سنگھ تو کیا تمام دُنیا سے جنگ کرنے پر آمادہ ہو جاؤں۔ ورسٹڈ کے تھانوں کے تھان خرید لوں۔ نئے گرم کوٹ کے لئے کپڑا خریدنے کا خیال دل میں پیدا ہوا ہی تھا کہ ٹِپّا منی بھاگتی ہوئی کہیں سے

آگئی۔ آتے ہی برآمدے میں ناچنے اور گانے لگی۔ اُس کی حرکات کتھاکلی مدرا سے زیادہ کیف انگیز تھیں۔

مجھے دیکھتے ہوئے پشپا منی نے اپنا ناچ اور گانا ختم کر دیا۔ بولی۔

"بابوجی . . . . آپ آگئے ہیں —— آج بڑی بہن جی (اُستانی) نے کہا تھا۔ میز پوش کے لیئے دوسوتی لانا۔ اور گرم کپڑے پر کاٹ سکھائی جائے گی۔ گینیا ماپ کے لیئے اور گرم کپڑا . . . ."

چونکہ اس وقت میرے گرم کوٹ خریدنے کی بات ہو رہی تھی۔ شمی نے زور سے ایک چپت اُس کے منہ پر لگائی اور بولی۔

"اِس جنم جلی کو ہر وقت . . . . . ہر وقت کچھ نہ کچھ خریدنا ہی ہوتا ہے . . . مشکل سے انہیں کوٹ سلوانے پر راضی کر رہی ہوں . . ."

—— وہ پشپا منی کا رونا اور میرا اپنا کوٹ !

میں نے خلافِ عادت اونچی آواز سے کہا "شمی"!

شمی کانپ گئی۔ میں نے غصے سے آنکھیں لال کرتے ہوئے کہا۔

"میرے اس کوٹ کی مرمت کر دو . . . . . ابھی . . . . . کسی طرح کرو۔ . . . . . ایسے جیسے رو پیٹ کر منگل سنگھ کی گیلی لکڑیاں جلا لیتی ہو . . . . تمہاری آنکھیں! ہاں! یاد آیا . . . . . دیکھو تو پشپا منی کیسے رو رہی ہے۔ پوپی بیٹا! اِدھر آؤ نا . . . . اِدھر آؤ میری بچی۔ کیا کہا تھا تم نے؟

بولو تو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ودوسونی ؟ گنیا ماپ کے لئے اور کاٹ سیکھنے کو گرم کپڑا ؟
ـــــــ بچو ننھا بھی تو ٹرائسکل کا راگ الاپتا اور غبارے کے لئے مچلتا سو گیا ہوگا۔ اُسے غبارہ نہ لے دوگی تو میرا کوٹ سل جائے گا۔ ہے نا ؟
۔ ۔ ۔ کتنا رویا ہوگا بےچارہ ۔ ۔ ۔ ۔ شمی ! کہاں ہے بچو ؟

"جی سو رہا ہے ۔ ۔ ۔ " شمی نے سہمے ہوئے جواب دیا۔

" اگر میرے گرم کوٹ کے لئے تم ان معصوموں سے ایسا سلوک کردگی۔ تو مجھے تمہاری آنکھوں کی پرواہی کیا ہے ؟" پھر میں نے دل میں کہا۔ کیا یہ سب کچھ میرے گرم کوٹ کے لئے ہو رہا ہے۔ شمی سچی ہے یا میں سچا ہوں۔ پہلے میں نے کہا ـــــــ دونوں ۔ ۔ مگر جو سچا ہوتا ہے۔ اُس کا ہاتھ ہمیشہ اوپر رہتا ہے۔ میں نے خود ہی دبتے ہوئے کہا۔

"تم خود بھی تو اُس دن کافوری رنگ کے مینا کار کانٹوں کے لئے کہہ رہی تھیں ۔ ۔ ۔ "

"ہاں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جی ۔ ۔ ۔ ۔ کہہ تو رہی تھی مگر ۔ ۔ ۔ "

مگر ۔ ۔ ۔ مگر اس وقت تو مجھے اپنے گرم کوٹ کی جیب میں دس روپے کا نوٹ ایک بڑا بھاری خزانہ معلوم ہو رہا تھا !

× × × × × × × ×

دوسرے دن شمی نے میرا کوٹ کہنیوں پر سے رفو کر دیا۔ ایک جگہ جہاں پر سے کپڑا بالکل اڑ گیا تھا۔ صفائی اور احتیاط سے کام لینے کے باوجود سلائی پر بدنما سلوٹیں پڑنے لگیں۔ اس وقت معراج دین ٹیلر ماسٹر کی دکان کی دکان میرے ذہن میں گھومنے لگی۔ اور یہ میرے تخیل کی پختہ کاری تھی۔ میرے تخیل کی پختہ کاری اکثر مجھے مصیبت میں ڈالے رکھتی ہے۔ میں نے دل میں کہا "معراج دین کی دوکان پر ایسے سوٹ بھی تو ہوتے ہیں جن پر سلائی سمیت سو روپے سے بھی زیادہ لاگت آتی ہے۔۔۔ میں ایک معمولی کلرک ہوں۔۔۔۔۔۔ اس کی دکان میں لٹکے ہوئے سوٹوں کا تصور کرنا عبث ہے۔۔۔ عبث۔۔۔"

مجھے فرصت میں پا کر شمی میرے پاس آ بیٹھی۔ اور ہم دونوں خریدی جانے والی چیزوں کی فہرست بنانے لگے۔۔۔۔ جب ماں باپ اکٹھے ہوتے ہیں تو بچے بھی آ جاتے ہیں۔۔۔ پُشپا منی اور بچو آ گئے۔ آندھی اور بارش کی طرح شور مچاتے ہوئے۔

شمی کو خوش کرنے کے لیئے نہیں بلکہ یوں ہی میں نے کافوری رنگ کے مینا کار کانٹے سب سے پہلے لکھے۔ اچانک رسوئی کی طرف میری نظر اُٹھی۔ چولھے میں لکڑیاں دھڑ دھڑ جل رہی تھیں۔۔۔۔ اور ادھر شمی کی آنکھیں بھی دو چمکتے ہوئے ستاروں کی طرح روشن تھیں۔

معلوم ہوا کہ منگل سنگھ گیلی لکڑیاں واپس لے گیا ہے۔

"وہ شہتوت کے ڈنڈے جل رہے ہیں۔ اور کھوکھا"۔۔۔۔ ششی نے کہا۔

اور اوپلے؟"

"جی ہاں، اوپلے بھی۔۔۔"

"منگل سنگھ دیوتا ہے۔۔۔۔ شاید میں بھی عنقریب گرم کوٹ کے لئے اچھا سا ورسٹڈ خرید لوں۔ تاکہ تمہاری آنکھیں یونہی چمکتی رہیں انہیں تکلیف نہ ہو ـــــ اس ماہ کی تنخواہ میں تو گنجائش نہیں۔۔۔۔ اگلے ماہ ضرور۔۔۔۔ ضرور۔۔۔۔"

"جی ہاں، جب سردی گذر جائے گی۔۔۔"

پشپا منی نے کئی چیزیں لکھائیں۔ دو سوتی، گنیا باپ کے لئے گرم بلیزر، سبز رنگ کا ایک گز مربع، ڈی، ایم، سی کے گولے، گوٹے کی مغزی ـــــ اور امرتیاں اور بہت سے گلاب جامن۔۔۔۔ موئی نے سب کچھ ہی تو لکھوا دیا۔ مجھے دائمی قبض تھی۔ میں چاہتا تھا۔ کہ یونانی دواخانہ سے اطریفل زمانی کا ایک ڈبہ بھی لا رکھوں۔ دودھ کے ساتھ تھوڑا سا پی کر سو جایا کروں گا۔ مگر موئی پشپا نے اس کے لئے گنجائش ہی کہاں رکھی تھی۔ اور جب پشپا منی نے کہا "گلاب جامن" تو اسکے

منہ میں پانی بھر آیا۔ میں نے کہا سب سے ضروری چیز تو یہی ہے....
شہر سے واپس آنے پر میں گلاب جامن وہاں چھپا دوں گا۔ جہاں
سیڑھیوں میں باہر جمعدار اپنا دودھ کا کلسہ رکھ دیا کرتا ہے۔ اور پشامنی
سے کہوں گا کہ میں تو لانا ہی بھول گیا.... تمہارے لیئے گلاب جامن....
.... اوہو! .... اُس وقت اُس کے منہ میں پھر پانی بھر آئے گا۔
اور گلاب جامن نہ پاکر اُس کی عجیب کیفیت ہوگی۔

پھر میں نے سوچا۔ بچو بھی تو صبح سے غبارے اور ٹرائسکل کے لیئے
ضد کر رہا تھا۔ میں نے ایک مرتبہ اپنے آپ سے سوال کیا۔ "اطریفل زمانی"؟
شمی بچو کو پچکارتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ "بچو بیٹی کو ٹرائسکل لے دوں
گی۔ اگلے مہینے ...... بچو بیٹی سارا دن چلایا کرے گی۔ ٹرائسکل ....
پوپی منا کچھ نہیں لے گا...."

بچو چلایا کرے "گی" اور پوپی منا نہیں "لے گا"!

——— اور میں نے شمی کی آنکھوں کی قسم کھائی۔ کہ جب تک
ٹرائسکل کے لیئے چھ سات روپے جیب میں نہ ہوں۔ میں نیلے گنبد کے
بازار سے نہیں گذروں گا۔ اس لیئے کہ دام نہ ہونے کی صورت میں نیلے گنبد
سے گذرنا بہت معیوب ہے۔ خواہ نخواہ اپنے آپ پر غصہ آئے گا۔ اپنی
ذات سے نفرت پیدا ہوگی۔

اُس وقت شمی بلجیمی آئینے کی بیضوی ٹکڑی کے سامنے اپنے کافوری سپید سوٹ میں کھڑی تھی۔ میں چپکے سے اُس کے پیچھے جا کھڑا ہؤا اور کہنے لگا" میں بتاؤں تم اس وقت کیا سوچ رہی ہو؟"

"بتاؤ تو جانوں . . ."

"تم کہہ رہی ہو۔ کافوری سپید سوٹ کے ساتھ وہ کافوری رنگ کے مینا کار کانٹے پہن کر ضلع دار کی بیوی کے ہاں جاؤں تو دنگ رہ جائے . . . . . ."

"نہیں تو" شمی نے ہنستے ہوئے کہا " آپ میری آنکھوں کی تعریف کرتے ہیں۔ میں نے کہا دیکھوں تو اِن میں کیا دھرا ہے . . . سچی بات تو یہ ہے کہ اگر آپ سچ مچ میری آنکھوں کے مداح ہوتے۔ تو کبھی کا گرم . . ."

میں نے شمی کے منہ پہ ہاتھ رکھ دیا۔ میری تمام خوشی بے بسی میں بدل گئی۔ میں نے آہستہ سے کہا " بس . . . . اِدھر دیکھو . . . . اگلے مہینے —— ضرور خرید لوں گا . . . ."

"جی ہاں، جب سردی . . . ."

—— پھر میں اپنی اِس حسین دنیا کو جس کی تخلیق پر محض دس روپے صرف ہوئے تھے۔ تصوّر میں بسائے بازار چلا گیا۔

× × × × × ×

میرے سوا انار کلی میں سے گذرنے والے ہر ذی عزت آدمی نے گرم سوٹ پہن رکھا تھا۔ لاہور کے ایک لحیم و شحیم جنٹلمین کی گردن نکٹائی اور مکلف کالر کے سبب میرے چھوٹے بھائی کے پالتو دیلی گئے "ٹائیگر" کی گردن کی طرح اکڑی ہوئی تھی۔ میں نے ان سوٹوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"لوگ سچ مچ بہت مفلس ہو گئے ہیں...... اس مہینے معلوم کتنا سونا چاندی ہمارے ملک سے باہر چلا گیا ہے۔" کانٹوں کی دکان پر میں نے کئی جوڑیاں کانٹے دیکھے۔ اپنی تخئیل کی پختہ کاری سے میں شمی کی کافوری سپید سوٹ میں ملبوس ذہنی تصویر کو کانٹے پہنا کر پسند یا ناپسند کر لیتا...... کافوری سپید سوٹ...... کافوری مینا کار کانٹے...... کثرتِ اقسام کے باعث ان میں سے میں ایک بھی منتخب نہ کر سکا۔

اُس وقت بازار میں مجھے یزدانی مل گیا۔ وہ تفریح کلب سے جو در اصل پریل کلب تھی۔ پندرہ روپے جیت کر آیا تھا۔ اُس کے چہرے پر اگر سرخی اور بشاشت کی لہریں دکھائی دیتی تھیں۔ تو کچھ تعجب کی بات نہ تھی۔ میں ایک ہاتھ سے اپنی جیب کی سلوٹوں کو چھپانے لگا۔ نچلی بائیں جیب پر ایک روپے کے برابر گوٹ سے ملتے ہوئے رنگ

کا پیوند بہت ہی ناموزوں دکھائی دے رہا تھا۔ . . . میں اُسے بھی ایک ہاتھ سے چھپاتا رہا۔ پھر میں نے دل میں کہا۔ کیا عجب یزدانی نے میرے شانے پر ہاتھ رکھنے سے پہلے میری جیب پر کی سلوٹیں اور وہ روپے برابر کوٹ کے رنگ کا پیوند دیکھ لیا ہو . . . ۔ اس کا بھی ردِّ عمل شروع ہؤا اور میں نے دلیری سے کہا

"مجھے کیا پرواہ ہے . . . . . . یزدانی مجھے کونسی فضیلت بخش دے گا . . . اور اس میں بات ہی کیا ہے۔ یزدانی اور سنتا سنگھ نے بارہا مجھ سے کہا ہے کہ وہ رفعتِ ذہنی کی زیادہ پرواہ کرتے ہیں۔ اور ورسٹڈ کی کم ۔"

مجھ سے کوئی پوچھے ۔ میں ورسٹڈ کی زیادہ پرواہ کرتا ہوں۔ اور رفعت ذہنی کی کم!

یزدانی رخصت ہؤا اور جب تک وہ نظر سے اوجھل نہ ہو گیا میں غور سے اُس کے کوٹ کے نفیس ورسٹڈ کو پشت کی جانب سے دیکھتا رہا۔

پھر میں نے سوچا کہ سب سے پہلے مجھے پشپا منی کے لئے گلاب جامن اور امرتیاں خریدنی چاہئیں۔ کہیں واپسی پر سچ مچ بھول ہی نہ جاؤں۔ گھر پہنچکر انہیں چھپانے سے خوب تماشا رہے گا مٹھائی کی

دکان پر کھولتے ہوئے روغن میں کچوریاں خوب پھول رہی تھیں ۔ میرے منہ میں پانی بھر آیا ۔ اس طرح جیسے گلاب جامن کے تخیل سے پشپا منی کے منہ میں پانی بھر آیا تھا ۔ قبض اور اطریفل زمانی کے باوجود میں سفید پتھر کی میز پر کہنیاں ٹکا کر بہت رغبت سے کچوریاں کھانے لگا ۔ ۔ ۔ ۔

ہاتھ دھونے کے بعد جب پیسوں کے لئے جیب ٹٹولی ۔ تو اس میں کچھ بھی نہ تھا ۔ دس کا نوٹ کہیں گر گیا تھا !

× × × × × ×

کوٹ کی اندرونی جیب میں ایک بڑا سا سوراخ ہو رہا تھا ۔ نقلی ریشم کو ٹڈیاں چاٹ گئی تھیں ۔ جیب میں ہاتھ ڈالنے پر اُس جگہ جہاں مرا انچا ، مرا انچا اینڈ کو کا لیبل لگا ہوا تھا ۔ میرا ہاتھ باہر نکل آیا ۔ نوٹ وہیں سے باہر گر گیا ہو گا ۔

ایک لمحہ میں میں یوں دکھائی دینے لگا ۔ جیسے کوئی بھولی سی بھیڑ اپنی خوبصورت پشم اتر جانے پر دکھائی دینے لگتی ہے ۔

حلوائی بھانپ گیا ۔ خود ہی بولا ۔

" کوئی بات نہیں بابوجی ۔ ۔ ۔ ۔ پیسے کل آجائیں گے ۔"

میں کچھ نہ بولا ۔ ۔ ۔ ۔ کچھ بول ہی نہ سکا ۔

صرف اظہار تشکر کے لئے میں نے حلوائی کی طرف دیکھا ۔ حلوائی کے

پاس ہی گلاب جامن چاشنی میں ڈوبے پڑے تھے۔ روغن میں پھولتی ہوئی کچوریوں کے دھوئیں میں سے آتشیں سُرخ امرتیاں جگر پر داغ لگا رہی تھیں ..... اور ذہن میں پشپامنی کی دھندلی سی تصویر پھر گئی۔

میں وہاں سے بادامی باغ کی طرف چل دیا اور آدھ پون گھنٹہ کے قریب بادامی باغ کی ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ چلتا رہا۔ اس عرصہ میں جنکشن کی طرف سے ایک مال گاڑی آئی۔ اس کے پانچ منٹ بعد ایک شنٹ، اکرتا ہوا انجن جس میں سے دھکتے ہوتے سُرخ کوئلے لائن پر گر رہے تھے —— مگر اُس وقت قریب ہی کی سالٹ ریفائنری میں سے بہت سے مزدور اوور ٹائم لگا کر واپس لوٹ رہے تھے .... میں لائن کے ساتھ ساتھ دریا کے پل کی طرف چل دیا۔ چاندنی رات میں سردی کے باوجود کالج کے چند منچلے نوجوان کشتی چلا رہے تھے۔

"قدرت نے عجیب سزا دی ہے مجھے" میں نے کہا۔ "پشپامنی کے لئے گوٹے کی مغزی، دوسوتی، گلاب جامن اور نشمی کیلئے کافوری مینا کار کلنٹے خریدنے سے بھی بڑھ کر کوئی گناہ سرزد ہو سکتا ہے۔ کس بے رحمی اور بے دردی سے میری ایک حسین مگر بہت سستی دنیا برباد کر دی گئی ہے ...... جی تو چاہتا ہے کہ میں بھی

قدرت کا ایک شاہکار توڑ پھوڑ کے رکھ دوں۔

——— مگر پانی میں کشتی ران لڑکا کہہ رہا تھا۔

اس موسم میں تو راوی کا پانی گھٹنے گھٹنے سے زیادہ کہیں نہیں ہوتا۔"

"سارا پانی تو اوپر سے اپر باری دواب لے لیتی ہے . . . . . اور یوں بھی آج کل پہاڑوں پر برف نہیں پگھلتی" . . . . دوسرے نے کہا۔

میں ناچار گھر کی طرف لوٹا۔ اور نہایت بے دلی سے زنجیر ہلائی۔ میری خواہش اور اندازے کے مطابق پشپا منی اور بچو پنھا بہت دیر ہوئی دہلیز پر سے اٹھ کر بستروں میں جا سوئے تھے۔ سشمی چولھے کے پاس شہتوت کے نیم جان کوئلوں کو تاپتی ہوئی کئی مرتبہ اونگھی اور کئی مرتبہ چونکی تھی۔ وہ مجھے خالی ہاتھ دیکھ کر ٹھٹک گئی۔ اسی کے سامنے میں نے جیب کے اندر ہاتھ ڈالا اور لیبل کے نیچے سے نکال لیا۔ سشمی سب کچھ سمجھ گئی۔ وہ کچھ نہ بولی . . . . . کچھ بول ہی نہ سکی۔

میں نے کوٹ کھونٹی پر لٹکا دیا۔ میرے پاس ہی دیوار کا سہارا لے کر سشمی بیٹھ گئی اور ہم دونوں سوتے ہوئے بچوں اور کھونٹی پر لٹکتے ہوئے گرم کوٹ کو دیکھنے لگے۔

اگر شمی نے میرا انتظار کئے بغیر وہ کافوری سوٹ بدل دیا ہوتا۔ تو شاید میری حالت اتنی متغیر نہ ہوتی!

× × × × × × ×

یزدانی اور سنتا سنگھ تفریح کلب میں پریل کھیل رہے تھے۔ انہوں نے دو دو، تین تین گھونٹ پی بھی رکھی تھی۔ مجھ سے بھی پینے کے لئے اصرار کرنے لگے۔ مگر میں نے انکار کر دیا۔ اس لئے کہ میری جیب میں دام نہ تھے۔ سنتا سنگھ نے اپنی طرف سے ایک آدھ گھونٹ زبردستی مجھے بھی پلا دیا۔ شاید اس لئے کہ وہ جان گئے تھے۔ کہ اس کے پاس پیسے نہیں ہیں۔ یا شاید اس لئے کہ وہ رفعت ذہنی کی ورسٹڈ سے زیادہ پروا کرتے تھے۔

اگر گھر میں اُس دن شمی کو وہی کافوری سپید سوٹ پہنے ہوئے دیکھ کر نہ آتا تو شاید پریل میں قسمت آزمائی کرنے کو میرا جی بھی نہ چاہتا۔ میں نے کہا۔ کاش! میری جیب میں ایک دو روپے ہوتے تو کیا عجب تھا کہ میں بہت سے روپے بنا لیتا ـــــــ مگر میری جیب میں کل پونے چار آنے تھے۔

یزدانی اور سنتا سنگھ نہایت عمدہ ورسٹڈ کے سوٹ پہنے نیک عالم کلب کے سیکرٹری سے جھگڑ رہے تھے نیک عالم کہہ رہا تھا کہ وہ

تفریح کلب کو پریل کلب اور "بار" بنتے ہوئے کبھی نہیں دیکھ سکتا۔
اُس وقت میں نے ایک مایوس آدمی کے مخصوص انداز میں جیب میں ہاتھ ڈالا۔ اور کہا "بیوی بچوں کے لئے کچھ خریدنا قدرت کے نزدیک گناہ ہے۔ اس حساب سے پریل کھیلنے کے لئے تو اُسے اپنی گرہ سے دام دے دینے چاہئیں۔ ہی ہی . . . . . غی غی . . . ."

اندرونی کیسہ . . . . . . بائیں نچلی جیب . . . . کوٹ میں پشت کی طرف مجھے کوئی کاغذ سرکتا ہؤا معلوم ہؤا۔ اُسے سرکاتے ہوئے . . . . میں نے دائیں جیب کے سوراخ کے نزدیک جا نکالا۔

——— وہ دس روپے کا نوٹ تھا۔ جو اُس دن اندرونی جیب کی تہ کے سوراخ میں سے گذر کر کوٹ کے اندر ہی اندر گم ہو گیا تھا!

× × × × × ×

اُس دن میں نے قدرت سے انتقام لیا۔ میں اُس کی خواہش کے مطابق پریل وریل نہ کھیلا۔ نوٹ کو مٹھی میں دبائے گھر کی طرف بھاگا۔ اگر اُس دن میرا انتظار کئے بغیر شمی نے وہ کا فوری سوٹ بدل دیا ہوتا۔ تو میں خوشی سے یوں دیوانہ کبھی نہ ہوتا۔

ہاں، پھر چلنے لگا وہی تخیل کا دور۔ گویا ایک حسین سے حسین دُنیا کی تخلیق میں دس روپے سے اوپر ایک دمڑی بھی خرچ نہیں آتی جب

میں بہت سی چیزوں کی فہرست بنا رہا تھا۔ شمی نے میرے ہاتھ سے کاغذ چھین کر پرزے پرزے کر دیا اور بولی۔

"اتنے قلعے مت بنایئے ...... پھر نوٹ کو نظر لگ جائے گی"۔

"شمی ٹھیک کہتی ہے" میں نے سوچتے ہوئے کہا۔ "نہ تخیل اتنا رنگین ہو اور نہ محرومی سے اتنا دکھ پہنچے"۔

پھر میں نے کہا: "ایک بات ہے شمی! مجھے ڈر ہے کہ نوٹ پھر کہیں مجھ سے گم نہ ہو جائے ..... تمہاری کھیمو (پڑوسن) بازار جا رہی ہے۔ اُس کے ساتھ جا کر تم یہ سب چیزیں خود ہی خرید لاؤ ..... کافوری مینا کاری کانٹے .... ڈی ایم سی کے گوٹے، مغزی ..... اور دیکھو پوپی منا کے لئے گلاب جامن ضرور لانا ... ضرور ...."

شمی نے کھیمو کے ساتھ جانا منظور کر لیا۔ اور اُس شام شمی نے کشمیرے کا ایک نہایت عمدہ سوٹ پہنا۔

بچوں کے شور و غوغا سے میری طبیعت بہت گھبراتی ہے۔ مگر اس دن میں عرصہ تک بچہ ننھے کو اُس کی ماں کی غیر حاضری میں بہلاتا رہا۔ وہ رسوئی سے ایندھن کی کوٹھی، غسل خانے، نیم چھت پر ــــ سب جگہ اُسے ڈھونڈتا پھرا میں نے اُسے پچکارتے ہوئے کہا۔

وہ ٹرائسکل لینے گئی ہے .... نہیں جانے دو۔ ٹرائسکل گندی

تفریح کلب کو پریل کلب اور ' بار ' بنتے ہوئے کبھی نہیں دیکھ سکتا۔
اُس وقت میں نے ایک مایوس آدمی کے مخصوص انداز میں جیب میں
ہاتھ ڈالا۔ اور کہا " بیوی بچوں کے لئے کچھ خریدنا قدرت کے نزدیک
گناہ ہے۔ اس حساب سے پریل کھیلنے کے لئے تو اُسے اپنی گرہ سے
دام دے دینے چاہئیں۔ ہی ہی . . . . . غی غی . . . . "

اندرونی کیسہ . . . . . . بائیں نچلی جیب . . . . کوٹ میں پشت
کی طرف مجھے کوئی کاغذ سرکتا ہوا معلوم ہوا۔ اُسے سرکاتے ہوئے . . . .
میں نے دائیں جیب کے سوراخ کے نزدیک جا نکالا۔

——— وہ دس روپے کا نوٹ تھا۔ جو اُس دن اندرونی جیب
کی تہ کے سوراخ میں سے گذر کر کوٹ کے اندر ہی اندر گم ہو گیا تھا!

× × × × × ×

اُس دن میں نے قدرت سے انتقام لیا۔ میں اُس کی خواہش کے
مطابق پریل وریل نہ کھیلا۔ نوٹ کو مٹھی میں دبائے گھر کی طرف بھاگا۔ اگر
اُس دن میرا انتظار کئے بغیر شمی نے وہ کافوری سوٹ بدل دیا ہوتا۔ تو
میں خوشی سے یوں دیوانہ کبھی نہ ہوتا۔

ہاں، پھر چلنے لگا وہی تخیل کا دور۔ گویا ایک حسین سے حسین دُنیا
کی تخلیق میں دس روپے سے اوپر ایک دمڑی بھی خرچ نہیں آتی جب

میں بہت سی چیزوں کی فہرست بنا رہا تھا۔ شمی نے میرے ہاتھ سے کاغذ چھین کر پرزے پرزے کر دیا اور بولی۔

"اتنے قلعے مت بنایئے ...... پھر لوٹ کو نظر لگ جائے گی۔"

"شمی ٹھیک کہتی ہے" میں نے سوچتے ہوئے کہا۔ "نہ تخیل اتنا رنگین ہو اور نہ محرومی سے اتنا دکھ پہنچے۔"

پھر میں نے کہا "ایک بات ہے شمی! مجھے ڈر ہے کہ لوٹ پھر کہیں مجھ سے گم نہ ہو جائے ..... تمہاری کھیمو (پڑوسن) بازار جا رہی ہے۔ اس کے ساتھ جا کر تم یہ سب چیزیں خود ہی خرید لاؤ .... کافوری مینا کا کانٹے .... ڈی ایم سی کے گوٹے، مغزی ..... اور دیکھو پوپی منا کے لئے گلاب جامن ضرور لانا ... ضرور ...."

شمی نے کھیمو کے ساتھ جانا منظور کر لیا۔ اور اس شام شمی نے کشمیرے کا ایک نہایت عمدہ سوٹ پہنا۔

بچوں کے شور و غوغا سے میری طبیعت بہت گھبراتی ہے۔ مگر اس دن میں عرصہ تک بچہ ننھے کو اس کی ماں کی غیر حاضری میں بہلاتا رہا۔ وہ رسوئی سے ایندھن کی کوٹھی، غسل خانے، نیم چھت پر ـــــ سب جگہ اسے ڈھونڈتا پھرا۔ میں نے اسے پچکارتے ہوئے کہا۔

وہ ٹرائسکل لینے گئی ہے ..... نہیں جانے دو۔ ٹرائسکل گندی

چیز ہوتی ہے۔ اخ تھو۔ ۔ ۔ غبارہ لائے گی' بی بی تمہارے لئے' بہت
خوبصورت غبارہ۔ ۔ ۔ ۔"

"بچو بیٹی" نے میرے سامنے تھوک دیا۔ بولی "اے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ای
۔ ۔ ۔ ۔ ۔ گندی"۔

میں نے کہا "کوئی دیکھے تو۔ ۔ ۔ ۔ کیسا بیٹیوں جیسا بیٹا ہے"۔
پشپا منی کو بھی میں نے گود میں لے لیا اور کہا۔ پوپی منّا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔
آج گلاب جامن جی بھر کر کھائے گا نا! ۔ ۔"

اُس کے منہ میں پانی بھر آیا۔ وہ گودی سے اتر پڑی' بولی "ایسا
معلوم ہوتا ہے۔ ۔ ۔ ۔ جیسے ایک بڑا سا گلاب جامن کھا رہی ہوں"۔
بچو روتا رہا۔ پشپا منی کنھا کلی مدرا سے زیادہ حسین ناچ برامدے
میں ناچتی رہی۔

مجھے میرے تخیل کی پرواز سے کون روک سکتا تھا۔ کہیں میرے
تخیل کے قلعے زمین پر نہ آ رہیں۔ اسی ڈر سے تو میں نے سُشمی کو بازار بھیجا
تھا۔ میں سوچ رہا تھا۔ سُشمی اب گھوڑے ہسپتال کے قریب پہنچ چکی ہوگی
۔ ۔ ۔ ۔ اب کالج روڈ کی نکڑ پر ہوگی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اب گندے انجن
کے پاس۔ ۔ ۔ ۔

اور ایک نہایت دھیمے انداز سے زنجیر ہلی۔

شمی سچ مچ آگئی تھی۔ دروازے پر۔

شمی اندر آتے ہوتے بولی: "میں نے دو روپے کھیمو سے اُدھار

لے کر بھی خرچ کر ڈالے ہیں۔"

"کوئی بات نہیں۔" میں نے کہا۔

پھر بچو، پوپی مُنا اور میں تینوں شمی کے آگے پیچھے گھومنے لگے۔

مگر شمی کے ہاتھ میں ایک بنڈل کے سوا کچھ نہ تھا۔ اُس نے

میز پر بنڈل کھولا......

——— وہ میرے کوٹ کے لئے بہت نفیس ورسٹڈ تھا!

پشپا منی نے کہا: "بی بی میرے گلاب جامن...."

شمی نے زور سے ایک چپت اس کے منہ پر لگا دی!

چھوکری کی لوٹ

چھوکری کی لُوٹ

بچپن کی بہت سی باتوں کے علاوہ پرسادی رام کو چھوکری کی لوٹ کی رسم اچھی طرح یاد تھی۔

دو بیاہے ہوئے بھائیوں کا ساری عمر ایک ہی گھر میں رہنا کسی قدر مشکل ہوتا ہے۔ خاص طور پر جبکہ ان میں سے ایک تو صبح و شام گھی شکر میں ملا کر کھانا پسند کرے۔ اور دوسرا اپنی قبول صورت بیوی کے سامنے ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں کے لئے کانوں کا کچا بنے لیکن محلہ شہسانی ٹولہ میں پرسادی کے تیا چمبا رام اور تایا ٹھنڈی رام جگت گورو اپنے باپ دادا کے مکان میں اکٹھے رہتے آئے تھے۔ یہ اکٹھے رہنے کی وجہ ہی تو تھی۔ کہ چمبا رام کا کاروبار اچھا چلتا تھا۔ اور ٹھنڈی رام کو نوکری سے اچھی خاصی آمدنی ہو جاتی تھی۔ عورتوں کی گودیاں ہری تھیں اور صحن کو برکت تھی۔ اور وہاں آم کے ایک بڑے درخت کے ساتھ کھرنی کا ایک خوبصورت سا پیڑ اُگ رہا تھا۔ جس کے پتوں سے کھچڑی ہوتی ہوئی لگر ونده کی بیل بازار میں چھدامی کی دوکان تک پہنچ گئی تھی۔ اور آس پاس کے گاؤں سے آئے ہوئے لوگوں کو ٹھنڈی میٹھی چھاؤں دیتی تھی۔

پرماتما کی کرنی ہے۔ پرسادی کی پیدائش کے ڈیڑھ دو سال بعد چمبارام کال بس ہو گئے۔ مگر جگت گوروجی نے بھاوج کو بیٹی کر کے جانا۔ اور پرسادی کو اپنا بیٹا کر کے پہچانا۔ اور تائی اماں بھی تو یوں بری نہ تھیں۔ اساڑھی اور ساونی کے دو موقعوں کے سوا جب کہ بٹوارہ گھر میں آتا۔ وہ پرسادی کی اماں کے ساتھ خندہ پیشانی سے پیش آتیں۔ کبھی تو یہ گمان ہونے لگتا جیسے دونوں ماں جائی بہنیں ہیں۔ اس اتفاق کی وجہ سے صحن کی برکت جوں کی توں رہی۔ صحن میں چار پانچ برس سے لیکر بیس اکیس برس تک کی لڑکیاں سہیلے، بدھائی، بچھوڑے اور دیس دیس کے گیت گاتیں۔ چرخے کاتتیں۔ اور سوت کی بڑی بڑی انٹیاں مینڈھیوں کی طرح گوندھ بُنائی کے لئے جولاہے کے ہاں بھیج دیتیں۔ کبھی کبھی کھلے موسم میں اُن کا رت جگا ہوتا تو صحن میں خوب رونق ہو جاتی۔ اُس وقت تو پرسادی سے چھوکرے کو پٹاریوں میں سے گلگلے، میوے، بادام، برفی وغیرہ کھانے کے لئے مل جاتی۔

پرسادی کی بہن رتنی ـــــ اسکی تائی کی لڑکی، عمر میں پرسادی سے گیارہ بارہ برس بڑی تھی۔ رتنی سے عمر کے اس فرق کا پرسادی کو بہت گلہ تھا۔ اور گلہ تھا بھی بالکل بجا۔ سچ پوچھو تو رتنی ایک پل بھر بھی اُس کے ساتھ نہ کھیلتی تھی۔ البتہ سردیوں میں سوتی ضرور تھی۔ اور جب تک وہ پرسادی کے ساتھ سو کر اُس کے بستر ے کو گرم نہ کر دیتی۔ پرسادی مچلتا رہتا۔

" رتنی آؤ . . . آؤنا رتنی . . . . دیکھو تو مارے سردی کے سن ہوا جاتا ہوں ۔"

رتنی بہت تنگ ہوتی ۔ تو سٹپٹا کر کہتی ۔" سوجا 'سوجا مونڈی کاٹے . . . میں کوئی انگیٹھی تھوڑے ہی ہوں ۔"

یہ تو ہوئی نارات کی بات ۔ دن کو رتنی کسی اپنی ہی دُھن میں مگن رہتی ۔ ہولے ہولے گاتی . . . 'میٹھے لاگے وا کے بول' . . . .

آخر کوئی تو پرسادی کے ساتھ کھیلنے والا چاہیئے تھا جب وہ بالکل اکیلا ہوتا ۔ تو اُسے کچھ کچھ سمجھ آتی ۔ کہ کال بس ہو کر سورگ میں چلے جانے کا کیا مطلب ہے وہاں لوگ اکیلے رہتے ہیں ۔ لیکن انہیں کوئی بھی تکلیف نہیں ہوتی ۔ جب وہ بہت بہت سوچ سوچ کر تھک جاتا تو دوڑا دوڑا ماتا رانی کے جوہڑ پر پہنچ جاتا ۔ تمام کپڑے اُتار کر کنارے پر رکھ دیتا ۔ اور کچھ دُور پانی میں جا کر ایک آدھ ڈبکی لگاتا ۔ اور بہت چکنی مٹی نکال لیتا ۔ اور گھر جا کر رتنی کو دیتا ۔ تاکہ وہ اُسے ایک مُنّا بنا دے ۔ بہت خوبصورت 'مٹی کا مُنا اور پھر وہ تمام دن منا کے ساتھ کھیلتا رہے گا ۔ اور اُسے تنگ کرنا چھوڑ دے گا ۔ رتنی کہتی . . . " دیکھو پرسو . . . میں تب بناؤنگی تمہارے لیئے منا ' اگر تم کوٹھا پھاند کر ملّو کنھیا کے پاس جاؤ ۔ اور اُسے کہو کہ آج شام وہ رتنی بہن کو ضرور ملیں ۔"

ملّو کنھیّا کے مکان کی ڈھلوان سی چھت کو رینگ کر چڑھنا کوئی کھیل

ٹھونڑا ہی تھا۔ رتنی خود گھوڑی بنکر پیٹھ کی اوٹ دیتی۔ تب کہیں پرسادی منڈیر تک پہنچتا۔ لاکھ آسرا لینے پر بھی اُس کی کہنیاں اور گھٹنے چھل جاتے۔ اور اتنی محنت کے بعد جب پرسادی لوٹتا تو دیکھتا۔ کہ رتنی کی بچی نے کوئی مُنّا وُنّا نہیں بنایا۔ اور پھلکاری کی اوڑھنی کو بوڑھی جمعدارنی کی طرح مُنہ پر کھسکائے وہی بالکل فضول اور بے مطلب سا گانا گنگنا رہی ہے......

میٹھے لاگے وا کے بول....

اُس وقت پرسادی کی بہت بُری حالت ہوتی۔ وہ چاہتا کہ وہ بھی کال بس ہو جائے۔ مگر کال بس ہونے سے پہلے بہت ہی پھونک کر بخار آتا ہے۔ ہڈیاں کڑکتی ہیں۔ یونہی دکھائی دیتا ہے۔ گویا کوئی بڑا سا خوفناک، کالے رنگ کا بھینسا سینگ مارنے کو دوڑا آ رہا ہے۔ انسان ڈر ڈر کر چیخیں مارتا اور کانپتا ہے۔ پرسادی کو یہ باتیں تمہیداً منظور نہ تھیں۔ بیٹھے بٹھائے پل بھر میں کال بس ہو جانا کسی بھاگوان کو ہی ملتا ہے۔ اُس وقت وہ روتے ہوئے ماں کے پاس جاتا اور کہتا۔

"چندو کے گھر مُنّا ہوتا ہے.... بِرجو کے گھر مُنّا ہوا ہے ماں.... ہمارے گھر کیوں نہیں ہوتا مُنّا؟.... تم ایسا جتن کرو ماں، ہمارے ہاں بھی ایک مُنّا تو ہو جائے...."

پرسادی کی ماں ایک بہت گہرا اور ٹھنڈا سانس لیتی۔ اور چھینکیتی

ہوئی لوہے کے ایک بڑے ہاون دستے میں لال لال مرچیں کوٹتی جاتی اور نہ جانے اُس کے جی میں کیا آتا۔ کہ پرسادی کی طرح بلک بلک کر رونے لگتی۔ پھر ایکا ایکی سب رونا دھونا چھوڑ کر تیزی تیزی سے مونڈھے پر اروی کو چھیلنے کے لئے رگڑنا شروع کر دیتی۔ اور جب پرسادی بالکل ضد ہی کئے جاتا۔ تو وہ کہتی۔

"پرسو بیٹا! یوں نہیں کہا کرتے اچھے لڑکے ... تمہارے پتا لایا کرتے ننھے منا ... وہ اب روٹھ گئے ہیں۔"

"تو تایا کو کہئے نا ...... وہی لادیں ہمارے گھر منا ..."

"وہ منا اپنے ہی گھر لائیں گے ... پگلے کوئی کسی کے گھر منا نہیں لاتا۔ ... بھاگ جاؤ۔ کھیلو، بہت باتیں کروگے تو ماروں گی۔ ہاں!"

—— پرسادی کو کیا۔ وہ تو چاہتا تھا۔ کہ اُسے کسی طرح ایک منا مل جائے۔ افسوس! اُس بچارے کو تو کوئی مٹی کا منا بھی نہ بنا دیتا تھا۔

× × × × × ×

کسی برساتی شام کے صاف اور سنہری جھٹ پٹے میں وہ برکت والا صحن ہر نوع و ہر عمر کی لڑکیوں، رنگ رنگیلے چرخوں اور پھٹوں کی ٹوکریوں سے بھرنا شروع ہو جاتا۔ تمام لڑکیاں عمر کے لحاظ سے دو ٹولیوں میں تقسیم ہو کر گگر وندہ اور رکھرنی کی آڑ میں بیٹھ جاتیں۔ چھوٹی لڑکیوں کی ٹولی علیحدہ

کھرنی کے نیچے ہوتی ۔ اس لئے کہ بڑی لڑکیوں کا خیال تھا۔ کہ ان کل کی بچیوں کو چنری اوڑھنے کا تو سلیقہ نہیں ۔ اور وہ ان کے گانے کو بھی تو نہیں سمجھ سکتیں ۔ صرف منہ اٹھا کر ایک ٹک ان کی طرف دیکھنے لگ جاتی ہیں پھر شرم آنے لگتی ہے ۔ منہ لال ہو جاتا ہے ۔ گانا گلے میں اٹک جاتا ہے ۔ اور پھر ملو کنھیّا کے متعلق باتیں کرنے میں انہیں کوئی مزا نہیں آسکتا ۔ ۔ ۔ ۔ اور وہ تکلے پر سے دھاگے کی لمبی سی تار اُٹھاتی ہوئی یکدم رُک کر انٹی کے نیچے ٹوکری میں سے بھُنے ہوئے دانے اور گڑ کھاتیں ۔ تبھی تو وہ سب کی سب گرم تھیں ۔ رتنی کی طرح ۔ ۔ ۔ ۔ اور اُن کے چھوٹے بھائی اُن کے ساتھ سخت سردی میں سونے کے لئے مچلتے تھے ۔

رام کلی دو سخنہ کہتی ۔ اور دوسری کوئی راگ الاپ کر اپنا سر لگروندہ میں چھپا لیتی تیسری اٹل کہتی ہوئی بیل سے لپٹ جاتی ۔ اور جب آم پر کوئل کو کو کرتی تو دھیرا کہتی ۔ ہائے ہائے ۔ ۔ ۔ ۔ جانے بڑا ہی دُکھ پہنچ رہا ہو ۔

اسی لئے تو وہ چھوٹی لڑکیوں سے کٹ کر الگ بیٹھتی تھیں ۔ پر سادی نے چھوٹی لڑکیوں کو اس قسم کا دُکھ پہنچتے کبھی نہیں دیکھا ۔ وہ تو چپ چاپ کھرنی کے نیچے بیٹھ کر پہیلیاں کہتیں ۔ انہیں اور خود پر سادی کو وہی سیدھی سادھی پہیلیاں بہت پیاری تھیں ۔ اس لئے کہ ان کی اپنی زندگی بھی ایک

سادہ سی پہیلی تھی۔ اُن پر وہ راز نہیں کھلا تھا۔ جو رام کلی، رتنی، کھیمو، دھیرا اور "مقابلتاً" معمر لڑکیوں پر آشکارا ہو گیا تھا۔

ہاں! ایک بات پرسادی نے بہت محسوس کی۔ وہ یہ تھی۔ کہ گکروندہ کی اوٹ میں بیٹھنے والی معمر لڑکیوں میں آئے دن تبدیلی رہتی۔ اور جیسے بھری دُنیا میں دائیں یا بائیں سے کبھی کبھی آواز آتی ہے۔ کہ فلاں کال بس ہو گیا۔ اسی طرح اُن میں سے آواز آتی۔

"چمپو بھی بیاہی گئی . . ."

یا ——

"رام کلی بھی گئی . . . چلو چھٹی ہوئی . . . پرماتما کرے اپنے گھر بیٹھی لاکھوں برس سہاگ منائے . . . لاکھوں برس۔"

اور پھر ——

"بہن! دھیرا کے بغیر تو گانے کا مزا ہی نہیں آتا۔ کیسی لٹک کے ساتھ کہتی تھی۔ وا بن سب جگ لاگے پھیکا۔ کتنی سندر تھی۔ جب ناک میں تیلی ڈالتی تو یوں ہی دکھائی دیتی جیسے گہنوں سے لدی ہو۔"

اور پھر ایک اور بول اُٹھتی —— "دھیرا گڑ بہت کھاتی تھی . . . کہتے ہیں بہت گڑ کھانا اولاد کے لئے اچھا نہیں ہوتا۔"

—— تو کیا گکروندہ کے نیچے بیٹھی ہوئی ٹولی میں کمی واقع ہو جاتی؟

بالکل نہیں۔ کیونکہ چمپو، رام کلی اور دھیرا کی مانند سہاگ منانے کے لئے چلی جانے والی لڑکیوں کی خالی جگہ کو کھرنی کے نیچے پہیلی ڈالتی ہوئی لڑکیاں آہستہ آہستہ پُر کر دیتیں۔ اور کھرنی کے نیچے بیٹھی ہوئی لڑکیوں کی خالی جگہ کو پُر کرنے کے لئے محلہ شہسوانی ٹولہ کی مائیں کثرت سے چھوکریاں جنتیں۔ اور یوں سلسلہ بندھا رہتا۔ یا شاید یہ سب کچھ اس لئے ہوتا۔ کہ جگت گورو جی کے صحن میں وہ ریل پیل، وہ دھما چوکڑی ہمیشہ ہمیشہ بنی رہے

مگھر اور پوہ کے دن تھے۔ جب مکر سکرانت آئی۔ اور عورتیں ڈھکے ہوئے پھل پھولوں کا تبادلہ کرنے لگیں۔ اور ایک دوسری کے سہاگ کو عرصہ تک قائم رہنے کی دعائیں دینے لگیں۔ کنواری کو کلاؤں نے بھی اپنی آنے والی خوشی کی زندگی کی پیش قدمی میں ایک دوسری کے شگن منائے۔ گھر کے مرد اُن عورتوں کی آزادی میں مخل ہونے سے ڈرتے ہوئے اپنی اپنی گڑگڑی وغیرہ اُٹھا کر باہر دوارے چلے گئے۔ ۔ ۔ ۔ پرسادی کی نانی اماں اِن دنوں بہت فکر مند رہتی تھیں۔ کہتی تھیں "کہیں چھوکری کے ہاتھ پیلے کر دوں۔ تو اپنی نیند سوؤں۔ ابھی تک بر نہیں ملا ۔ ۔ ۔ یہ سنجوگ کی بات ہے نا ۔ ۔ ۔ ۔ پرماتما ہی کرنے ہار ہے ۔ ۔ ۔ ۔ استری مرد کا وہی میل ملاتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ جہاں سنجوگ ہوں گے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہے پرماتما ــــــ !"

اُس روز تمام عورتیں برآمدے میں بیٹھی ٹھٹھے اور ہنسی مذاق کی باتیں کر رہی تھیں ۔ ایکا ایکی پرسادی کی تائی اماں نے سب کو مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

"لو بیٹی . . . . تیار ہو جاؤ سب . . . . اب میں اپنی چھوکری کی لوٹ مچاؤں گی . . . "

—— اس تہوار میں یہ رسم بھی عجیب ہوتی ہے ۔ جس کی لڑکی بہت جوان اور شادی کے قابل ہو جائے ۔ وہ اس کی لوٹ مچاتی ہے ۔ تائی اماں کی طرح کوئی بوڑھی سہاگن اُٹھ کر گری، چھوہارے، بیر اور قسم قسم کی پھل پھلاری لڑکی کے سر پر سے مٹھیاں بھر بھر کر گراتی ہے ۔ جب وہ چیزیں نیچے بکھر جاتی ہیں ۔ تو تمام کنواری کو کلائیں اور سہاگنیں گرتے ہوئے پھل پھولوں کو لوٹنے کے لئے جگت گوروجی کے صحن میں اُگے ہوئے پیڑوں اور بیل کے پتوں کی طرح کھچڑی ہو جاتی ہیں ۔ ہر ایک کی یہی خواہش ہوتی ہے ۔ کہ وہ پھل کھائے ۔ اگر سہاگن کھائے تو اُس کا مطلب ہوتا ہے ۔ کہ اس کے سہاگ کی عمر لمبی ہو جاتی ہے —— شاید لاکھ برس تک ! بانجھ کھائے تو اُسے چاند سا بیٹا پیدا ہو جاتا ہے ۔ کنواری کھائے تو اُس کی عنقریب ہی شادی ہو جاتی ہے ۔ اچھا سا بر مل جاتا ہے ۔ اسی لئے تو کنواری لڑکیاں اٹھا کر چپکے چپکے اور چوری چوری وہ پھل کھاتی ہیں ۔

پرسادی نے دیکھا۔ رتنی آپے سے باہر ہو رہی تھی۔ جی ہی جی میں ہنستی تھی۔ اور کچھ شرماتی تھی۔ جب کہ اُس کی لوٹ مچائی گئی۔۔۔۔ پرسادی کی ماں نے اُسے بتایا کہ چھوکری کی لوٹ کا یہ مطلب ہوتا ہے۔ کہ تمہاری رتنی بہن کو کوئی بیاہ کر لے جائیگا ——— کوئی لوٹ کر لے جائیگا۔۔۔۔ اور پرسادی کی اماں ہنسنے لگیں "تائی اماں خود بھی تو اپنی چھوکری کے لٹ جانے کو پسند کرتی ہیں۔ اور ایسے آدمی کی متلاشی ہیں۔ جو کہ اُسے سر سے پاؤں تک اپنی ہی ملکیت بنا کر ڈولی میں بٹھا چلدے۔ اور بڑے شور و غوغا کے ساتھ۔۔۔۔۔ باجے بجواتا ہؤا۔۔۔ ۔ اور پھر گھر میں سے آدھی جائداد سمیٹ کر لے جائے"۔۔۔۔

پرسادی نے سوچا۔ کسی کو کیا ؟ مصیبت تو اُسے ہوگی۔ سردیوں میں رتنی چلی جائے گی۔ تو اُس کے بستر کو کون گرم کرے گا۔ تائی اماں تو برف کی طرح ٹھنڈی ہیں۔ اور اماں تو تمام رات کھانسی رہتی ہیں۔ اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر پہلو بدلتی اور چھت کی کڑیاں گنتی چلی جاتی ہیں۔ نہ آپ سوتی ہیں۔ نہ سونے دیتی ہیں۔ کہتی ہیں میرے ساتھ سونا اچھا نہیں۔۔۔۔۔۔ مجھے دق ہے!

× × × × × × × × ×

تایا جگت گورو ٹھنڈی رام آدمی بہت کاریگر تھے۔ تبھی تو لوگ اُنہیں جگت گورو کہتے تھے۔ صبح شہر میں بھیجنے کے لئے کیلنڈروں کی

چھنتیاں بنواتے رہے۔ آٹھ بجے کے اندر اندر کھوتے ہیں گجر بلا تیار کر لیا۔ اور پھر جھٹ سے کام پر بھی چلے گئے۔ بلا کے آدمی تھے جگت گورو۔ اس دن پر سادی بھی انکے ساتھ کام پہ گیا۔

جگت گورو چنگی محصول پر محرّر تھے۔ تمام دن وہ گلقند بنانے کے لئے لیجانے والے گلاب کے پھولوں اور خام کھالوں پر محصول لگاتے رہے کبھی کبھی کسی سے کچھ لے کر اُسے یونہی چھوڑ دیتے۔ آخر جگت گورو تھے نا۔ اور رتنی کی لوٹ مچانی تھی۔ اس طرح دھیلا دھیلا پیسہ پیسہ کر کے ہی تو کچھ بنتا ہے۔ تبھی تو وہ موٹے ہو رہے تھے۔ کہتے ہیں رشوت لینے میں انسان موٹا ہوتا ہے۔ روح اور ضمیر سوکھتے جاتے ہیں پر جسم تو دکھائی دیتا ہے روح اور ضمیر کس کو دکھائی دیتی ہے؟

چنگی پر خوشیا اور روفاتی آئے۔ بر تو اُنہیں اچھا مل گیا تھا بہت ہی اچھا۔ اب ساہے کی تاریخ لینی تھی۔ جگت گورو نے لڑکے اور لڑکی کی جنم پتری پنڈت جی کو دکھا کر تاریخ سدھوا رکھی تھی۔ اور جنم پتریاں جیب میں لئے پھرتے تھے۔ خوشیا اور روفاتی کے پوچھنے پر فوراً تاریخ بتا دی۔ لڑکے کی طرف سے کوئی میر مدّو آیا تھا۔ سب "بڑے بھاگ ججمان کے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بڑے بھاگ ججمان کے ۔ ۔ ۔ ۔" کہتے ہوئے رخصت ہوئے۔

تائی اماں بڑی بے صبری سے ساہے کا انتظار کرنے لگیں۔ اُنہوں

نے کئی چاندی کے برتن بنوائے۔ سونے کے جھومر، جڑاؤ نکلیس، گھڑی چوڑی اور قسم قسم کے زیور تیار کروا لیئے۔ آخر اسی بات کے لیئے تو تایا نے گلقند بنانے کے لیئے لے جانے والی گلاب کی گٹھیں دو دو چار چار آنے لیکر چھوڑ دی تھیں۔ اور خام کھالوں کی گٹھیں دو دو چار چار روپے لے کر ......
بیسیوں گلاس، بڑی کڑاہی، حمام، ... ایک بڑا سا پلنگ بھی خریدا تھا۔ تایا نے۔ اس پر پرسادی اور رتنی کے سے چھ سو جائیں۔ پھر کرسی، میز، شنگار دان، باجہ، لڑکی کے سوٹ، لڑکے کے کپڑے اور بدائی پر روپے دینے کے لیئے شہر کے لوٹ گھر میں سے نئے روپے منگوائے — اور پرسادی سوچنے لگا۔ کیا یہ سب کچھ لٹا دینے کے لیئے ہے؟

پرسادی نے کہا۔ تایا کچھ اتنے سیانے نہیں دکھائی دیتے۔ مگر وفاتی، خوشیا، بیلی رام اور اڑوس پڑوس کے سب آدمی جگت گورو کی واہ وا کر رہے تھے۔ لڑکی کا دان کرنا سو گائے کے دان کے برابر ہوتا ہے تلادان سے کم پھل نہیں ملتا۔ وہ سب کہتے تھے۔ بھئی! جگت گورو کو یہ نام جلدی تھوڑے ہی ملا ہے۔ اسی لیئے تو یہ نام دیا ہے۔ بڑے سیانے، بڑے کاریگر آدمی ہیں۔ ایشور کسی کو بیٹی دے۔ تو لٹانے کے لیئے اتنا دھن بھی دے
...... واہ وا ...... واہ وا ......

پرسادی نے اماں سے تایا کی عقل کے متعلق پوچھا۔ تو وہ کہنے لگی۔

"بیٹا! یہ چھوکری کی لوٹ آج سے نہیں۔ جب سے دنیا بنی ہے۔ چلی آرہی ہے۔ سب اپنی اپنی بیٹیوں کو یوں دے دیتے ہیں۔ اتنی دولت اور دھن بھی . . . . ہائے! اس پر بھی بس ہو۔ تو کوئی لاکھ منائے بیٹیوں والے منتیں کرتے ہیں۔ پاؤں پڑتے ہیں۔ کیا جانے اُس کے سسرال روٹھ جائیں۔ تب جاکر ساری عمر کے لئے کوئی کسی کی بیٹی کو لیتا ہے۔ کوئی بہت بے ڈھب ہو۔ تو لے دے کر بھی بساتا نہیں . . . . . اور پھر کسی نصیبوں جلی کا بنایا سہاگ اجڑ جاتا ہے . . . . "

اور پرسادی کی ماں کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ وہ بولیں۔

"پرسو تو بھی بڑا ہو گا۔ تو ایک چھوکری لوٹ کر لائے گا۔ اسی طرح دھن دولت سمیت . . . . ایشور تیری عمر چار جگ لمبی کرے! . . . . اُسے اچھی طرح بسانا۔ مجھے نسچہ ہے۔ میں وہ بھاگوان سمے اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ سکوں گی۔"

اور پرسادی کی ماں رونے لگیں۔ پرسادی نے پوچھا "تو کہاں چلی جائے گی، ماں؟"

وہ اپنی آواز کو دباتے ہوئے بولیں۔

"تمہارے پتا کے پاس . . . . وہ بھی مجھے اسی طرح لوٹ کر لائے تھے، میں اُنہی کی ہوں۔"

—— پرسادی بجھے ہوئے تنور پر سے ٹانگیں لٹکائے تمام دن اداس خاطر بیٹھا اور سوچتا رہا۔ میں بڑا ہوں گا اور ایک چھوکری کو لوٹ لاؤں گا۔ اُس لڑکی کے گھر گلر دندہ کی بیل کے نیچے ایک لڑکی کی کمی ہو جائے گی۔ جیسے کوئی ادر پڑ کرے گی۔ ہاں! وہ بھی تو اپنے کسی بھائی کو سردیوں میں اپنے بستر میں جم جانے یا تائی اماں کے برف سے ٹھنڈے جسم کے ساتھ لگ کر سو جانے کے لئے چھوڑ آئے گی۔ اُس کا بھائی تو رہ رہ کر مجھے گالیاں دے گا۔ اور کہے گا۔ اس سے تو کہیں اچھا ہے۔ کہ میں کال بس ہو جاؤں۔

ساہے کے دن پرسادی کے جیجا بہت سے آدمیوں کے ساتھ آئے۔ اگر اماں نہ روکتی۔ تو پرسادی لٹھ لیکر سب کا مقابلہ کرتا۔ پھر کسی کی کیا مجال تھی کہ رتنی کو اتنی بے دردی سے لوٹ لے جانے کی جرأت کرتا اگرچہ جگت گورو اور تائی اماں کی اِس لوٹ میں خوشی تھی۔ تائی اماں منڈپ کے نیچے جھنڈیوں اور لکڑی کی چڑیوں کے نیچے بیٹھی تھی۔ ارد گرد عورتیں گا رہی تھیں۔ باہر باجا بج رہا تھا۔ اور پنڈت جی کے شلوکوں کی آواز اس شور و غوغا سے علیحدہ سنی جا سکتی تھی۔ جب پھیرے ہو گئے۔ تو سب نے تائی اماں اور جگت گورو کو بدھائی دی۔ تائی اماں کی سرخ پھلکاری اور جگت گورو جی کی گلابی پگڑی پر کیسر کے نشان لگائے گئے۔ اور پیلے

پیلے پھول اور پنکھڑیاں برسائی گئیں۔ جانے اُنھوں نے رتنی کو لٹا کر بہت سیاپا دکھائی۔ تائی اور اماں نے سبکدوشی کے ایک احساس سے اُس لوٹ کی خوشی میں دودھ کے دو بڑے بڑے کٹورے بھر کر پیئے۔

پرسادی کو جیجا ایک آنکھ نہ بھاتا تھا۔ پرسادی نے کہا۔ یہ مردہ سا، کالا کلوٹا آدمی رتنی بہن کو لوٹ کرے جائے گا۔ رتنی تو اس کی شکل دیکھ کر غش کھا جائے گی۔ لوٹ کرے جانے والے ڈاکو ہی تو ہوتے ہیں، بری بُری اور ڈراؤنی شکل کے . . . . اس میں اور ان میں اتنا فرق ہے۔ کہ ڈاکو منڈاسا باندھ کر آتے ہیں۔ اور یہ کالا کلوٹا جیجا سہرے پہن کر آیا ہے۔

جب کہاروں نے ڈولی اُٹھائی تو گھر بھر میں کہرام مچ گیا۔ آج پھر لکڑ ونڈہ کے نیچے ایک نشست خالی ہو رہی تھی۔ تائی اماں اونچے اونچے رونے لگیں۔ ہائے! بیٹی کا دھن عجیب ہے۔ پیدا ہوئی، راتیں جاگ مصیبتیں سہ، گو موت سے نکالا۔ پالا، پڑھایا، جوان کیا۔ اب یوں جا رہی ہے۔ جیسے میں اس کی کچھ ہوتی ہی نہیں۔ ایشور! بیٹی کسی کی کوکھ میں نہ پڑے۔ اس کے پیدا ہونے کا دُکھ بُرا.. ہائے! اس طرح تو کوئی آنکھیں نہیں پھیرتا۔ جگت گورو پرسادی کی طرح بلکنے لگے۔ اماں تو در و دیوار سے ٹکریں مارنے لگیں۔ ہائے! مجھ سے تو رتنی کا بچھڑا نہ سہا جائے گا۔ میری بیٹی

نے تو مجھے دوہاگ کا دُکھ بھلا دیا تھا.. ہائے! اس سنسار کی ریت جھوٹی، اس سے پریت جھوٹی.. جا.. بیٹی جا... جا اپنے گھر سکھی رہو۔ تیری دھمک ہمیں یہاں آتی رہے۔ تو لاکھوں برس سہاگ منائے۔

تمام لڑکیاں بچھوڑا گاتے ہوئے رُک رُک گئیں۔

ڈولی کا پردہ اُٹھا کر رتنی نے پرسادی کو گلے سے لگا کر خوب بھینچا۔ پرسادی بھی اُسے روتا دیکھ کر خوب رویا۔ رتنی کہتی تھی ” پرسو بھیا ــــ میرے لال! تو میرے بغیر سونا ہی نہیں تھا۔ اب تو رتنی کو کہاں ڈھونڈیگا؟“
پھر سب کو مخاطب ہوتے ہوئے کہنے لگی۔

” مجھے اس گھر میں رکھنے کی کوئی بھی حامی نہیں دیتا۔ سبھی تو میری جان کے لاگو ہو رہے ہیں۔“

اور جب جیتے جاگتے آدمیوں میں سے کسی نے اُسے نہ ٹھہرایا۔ تو رتنی دادا اور چمپا رام چچا کو یاد کر کے رونے لگی۔ در و دیوار سے باتیں کرنے لگی...... ”میرے بابل کے گھر کے دوار...... یہ محل...... یہ ماڑیاں، میں سمجھتی تھی میرا اپنا گھر ہے۔ کھڑکی...... اور میرے میٹھے آم...... بِرِدئی پتا، تیرے بستے مندروں میں سے مجھے زبردستی نکال کر لے جا رہے ہیں...... یہاں کا دانہ پانی چھوٹ گیا۔!“

× × × × × ×

جب رتنی چلی گئی۔ تو پرمادی اُسی بجھے ہوئے تنور پر اوداس خاطر بیٹھا ادھیڑ بُن کرتا رہا۔ طرح طرح کے خیال اور وسوسے اُسکے دِل میں آئے۔ اُس نے کہا۔ تائی اور اماں کے خیال کے مطابق جب پرماتما ہی مرد اور استری کا میل ملاتا ہے۔ تو پھر خوشیا اور وفاتی کی کیا ضرورت ہے؟ وہ یوں بھی تو گھر میں سے سیروں آٹا، گڑ اور گھی لے جاتے ہیں۔ گٹھوں کے گٹھے گنوں کے۔۔۔ ساگ پات، پکا، کچا —— بدماس کہیں کے۔۔۔ صرف اتنی سی بات کہتے ہیں "بڑے بھاگ ججمانی کے۔۔۔۔ بڑے بھاگ ججمانی کے۔" اور لادیتے ہیں۔ اتنا مردہ سا کالا کلوٹا جیجا۔ —— پرماتما کے کیے میں دخل دیتے ہیں نا۔ کیوں نہیں ملو کنھیا رتنی کو لے جاتے۔ پرماتما نے آپ ہی تو میل ملادیا تھا۔ اور رتنی بھی تو یہی کہتی تھی۔ کہ تمہارا جیجا ملو کنھیا ہے۔ کبھی کسی کے دو دو جیجے بھی ہوتے ہیں۔ میں تو ملو کنھیا کو ہی جیجا کہوں گا۔ اُس مردوے کو کبھی نہیں۔ لاکھ زور کرے کوئی۔

نہ جانے یہ لوگ چھوکری کی لوٹ کے اتنے خواہشمند کیوں ہوتے ہیں۔ پل پل گن کر ساہے کا انتظار کرتے ہیں۔ پھیروں کے بعد دودھ کے کٹورے پیتے اور بدھائیاں لیتے ہیں۔ اور پھر جب لوٹ ہوتی ہے تو روتے ہیں۔ اتنا مورکھ کون ہوگا۔ جو آپ ہی سب کام کاج کرے۔

اور پھر رہے۔ جانے کوئی کال بس ہو گیا ہو۔ اور پھر رتنی کی بھی تو جانے
کی مرضی نہ تھی۔ وہ دہلیز پکڑ پکڑ کر روتی تھی۔ بیچاری! برا حال تھا۔
سب گھر لٹا دیا۔ اور پھر ہاتھ جوڑتے رہے۔ قبول کرو۔ میں تو یوں
کبھی کسی کے پاؤں نہ پڑوں۔ اول تو دوں ہی نہیں۔ تو یوں پاؤں پڑ کر
منتیں کر کے کبھی نہ دوں۔ نہ لیں تو جائیں بھاڑ میں!

اُس دن پرسادی ساری رات تائی اماں کے برف سے ٹھنڈے
جسم کے ساتھ لگ کر جاگتا رہا۔

کچھ دنوں بعد رتنی آپ ہی آپ آگئی۔ پرسادی کو اُس نے بہت
چوما پیار کیا گویا وہ اب اپنے ننھے سے بھائی کو چھوڑ کر کہیں نہ جائیگی۔
اور اُسے خود بھی چھوکری کی لوٹ پسند نہیں۔ اُس رات پرسادی بڑے
سکھ اور چین سے رتنی کے ساتھ سویا۔ رتنی ساری رات پیار سے
پرسادی کو بھینچتی رہی ——— جب سویرے آنکھ کھلی تو رتنی بستر
میں نہ تھی۔ پتہ چلا۔ کہ وہی لٹیرا اُسے لوٹ کرلے گیا تھا۔

پرسادی پھر رویا۔ مگر ماں نے کہا" بیٹا! یہ رسم آج سے نہیں
جب سے دنیا بنی ہے۔ چلی آئی ہے"

سوچتے ہوئے پرسادی نے کہا۔ بڑے نخرے کرتی تھی رتنی۔
سچی بات تو یہ ہے۔ کہ یہ چھوکریاں خود بھی لٹ جانا پسند کرتی ہیں۔

وہ تو اپنے سوتے ہوئے بھائیوں کے جاگنے کا انتظار بھی نہیں کرتیں اور کالے کلوٹے جیجا کے ساتھ بھاگ جاتی ہیں۔"

× × × × × × × ×

اب کے جو رتنی آئی۔ تو چھوکری کی لوٹ کے متعلق پرسادی نے اپنا نظریہ بالکل اُلٹ دیا۔ اُس نے کہا۔ دراصل یہ لوٹ سب کے لئے اچھی ہوتی ہے۔ تائی، اماں، جگت گورو جی، اور خود رتنی بھی اسے پسند کرتی ہے۔ اور خاص طور پر اُسے بھی اچھی لگتی ہے۔ مُنا تو مل جاتا ہے رتنی نے اُسے جیجا کی طرح دبلا پتلا، مگر اپنی طرح کا گورا چٹا مُنا کھیلنے کو لا دیا تھا۔ پرسادی نے ماں کو بلاتے ہوئے کہا۔

"بھولی ماں . . . تُو تو جتن کرنے سے رہی . . . کیا تُو نہ لٹے گی، ماں؟"

پان شاپ

پان شاپ

بیگم بازار کی منحوس دکان میں ایک دفعہ پھر بیل دار دسُوتی کے بھاری بھاری پردے لٹکنے لگے۔ موجد" دافع چنبل وداد" اور جاپانی کھلونوں کی دُکان ——— اوساکا فیئر (جاپان سے متعلق ہے) کے ملازم استعجاب سے ٹھارولال فوٹوگرافر کو ادک پلائی کا ڈارک روم بناتے دیکھ کر اُس کے تاریک مستقبل پر آنسو بہانے لگے۔

" ایک ماہ سے زیادہ چوٹ نہ سہے گا۔۔۔ بیچارہ !"

" دکان کیا ہوگی ۔۔۔ بازار سے کچھ ہٹ کر ہے نا۔ نظر اُسے سامنے نہیں پاتی۔ اور بس ۔۔۔۔"

——— ایک ماہ، دو اور چار ۔۔۔ ٹھارولال وہیں تھا۔ موجد" دافع چنبل وداد" اور اوساکا فیئر کے ملازموں نے حیرت سے انگلیاں منہ میں ڈال لیں جب کہ ۱۱۔ اگست کی صبح، کو انھوں نے ایک جہازی سائز کا سائن بورڈ اُس منحوس دکان پر آویزاں ہوتے ہوئے دیکھا۔ ۶ × ۱۲ فٹ سائز کے سائن بورڈ پر خوبصورت حروف خالص صنعتی انداز سے ناچتے ہوئے" انٹرنیشنل فوٹو سٹوڈیو" کی شکل اختیار کر رہے تھے۔

اوساکا فیئر کے منتظم صمیم (خانزادہ) نے سیلولائیڈ کی ایک بڑی سی گڑیا کے اندرونی فیتے کو اُس کے اندرونی قلابوں سے احتیاط کے ساتھ باندھ دیا تاکہ گاہک کو شکایت کا موقعہ نہ ملے، اور پھر نھارو کی دکان کے آویزاں سائن بورڈ کو دیکھ کر مسکرانے لگا۔

"انٹر۔۔ نیشنل فوٹو سٹوڈیو!"

نھارو کا کام بیگم بازار، اُس کے نواح کے تین محلوں، سامنے کے نشیبی چوک یا چھاؤنی کے ہائی سکول تک محدود ہوگا۔ مگر وہ اپنی دکان کو ایک بین الاقوامی کاروبار سے کم نہیں دیکھنا چاہتا۔ کیا عجب جو اُسے کسی دن ٹیپرڈ گرا ڈ ٹمبکٹو، یا ہونولولو سے فوٹو کا مال مہیا کرنے کے آرڈر ملنے لگیں۔۔۔ بہر حال بین الاقوامی نام رکھنے میں حرج بھی تو کوئی نہیں۔ اِس نام سے دوکاندار کی فطری رجائیت ٹپکتی ہے۔

مگر افسوس! سودے کی بدعت ترقی پسند ہندوستانی دوکاندار کو بیگم بازار کے نواحی تین محلوں، سامنے کے نشیبی چوک اور چھاؤنی کے ہائی سکول سے دُور کیا جانے دے گی۔ وہ ہر جائز و ناجائز طریقہ سے گاہک کو پھنسانے کی کوشش میں کسب کمال کی تودھجیاں اڑا دیتا ہے۔ گویا اپنے پاؤں میں آپ بیڑیاں ڈالتا ہے۔ اور یوں زیادہ آمدنی کی توقع میں طبعی آمدنی بھی معدوم!

—— نھارو کی دوکان پر اس جہازی قد کے سائن بورڈ کے نیچے ایک

ایک اور ٹین کی پلیٹ پر "جدید عینک ساز" بھی لکھا تھا۔ ترقی پسند مگر بھولے بھالے تھارو نے جدید عینک سازی محض سودے کی بدعت یا نقل میں شروع کی تھی کیونکہ اس کا پڑوسی دوکاندار جرابوں کے کارخانہ کے ساتھ "ٹیٹاگھر" کاغذ بھی فروخت کرتا تھا۔

١١۔ اگست کی شام کو اوسا کا فیئر کا منتظم صمیم دخانزادہ) اور تھارو کچھ اداس خاطر ہو کر ملے۔ دونوں کی آمدنی کا بیشتر حصہ تعطیلاتِ گرما یا سرکاری دفاتر کے شملہ کی طرف کوچ کی نذر ہو چکا تھا۔ ان دنوں میں سٹوڈیو کے سامنے پان شاپ پر بہت رونق رہتی تھی۔

پان شاپ کے پیچیدار تختوں میں کھڑیا مٹی سے صاف کئے ہوئے شیشے بہت ہی خوبصورت دکھائی دیتے تھے۔ ایک ہلکی سبز جھلک رکھنے والے شیشے کے نیچے ایک ہک کے ساتھ ایک نفیس طلائی سیکنڈس گھڑی لٹک رہی تھی۔ اس کے نیچے قانون و فقہ کی کتابیں بے ترتیبی سے پڑی تھیں۔ شاید کوئی قانون کا بے قانون اور فضول خرچ طالب علم اتنی قیمتی کتابیں کوڑیوں کے مول گروی رکھ کر پیسے لے گیا تھا۔ کتابوں کے پیچھے ایک پرانی سنگر مشین پڑی تھی۔ اسے گروی رکھنے والے کو اتنی ضرورت یا اتنی جلدی تھی۔ کہ اس نے مشین پر سے ؛ ہاگہ کی گولی بھی نہ اٹھائی تھی۔

پان شاپ کے ایک کونے میں کانسی اور پیتل کے فلسطینی پیالوں کی

شکل کے گلدستے اور لمبی لمبی ٹانگوں والے کلنگ پڑے تھے۔ فرنیچر کی دو قطاروں میں اخروٹ کی لکڑی میں کشمیری تراش کا ایک بڑا سا کیبنٹ بھی پڑا تھا۔ اور دیوار کے ساتھ پان شاپ کا مالک ایک آہنی صندوقچی پہ اپنی کہنیاں رکھے ہوئے اپنے کسی گاہک سے باتیں کر رہا تھا۔

دو بلاوردی سپاہی پان شاپ کے مالک سے اجازت پاکر برآمدے میں پڑے ہوئے سائیکلوں کے نمبر دیکھ رہے تھے۔

"اے۔ ۱۱۷۸۵ —— نہیں۔

"اے ۲۲۲۳۱۲ —— یہ بھی نہیں۔"

"ایچ۔ ۹۷۴۰۱ —— یہ بھی نہیں۔ کوئی بھی نہیں۔ چلو۔"

ایک عیسائی لڑکی دو دفعہ بگیم بازار میں پان شاپ سے نشنبی چوک اور نشنبی چوک سے پان شاپ کی طرف واپس آئی۔ وہ بار بار غور سے پان شاپ کے اندر دیکھتی۔ اس وقت اس کے دبے ہوئے شانے پھر کنے لگتے۔ شاید وہ چاہتی تھی۔ کہ پان شاپ کے اندر بیٹھے ہوئے دو ایک آدمی چلے جائیں۔ اور سپاہی اپنا کام کر کے رخصت ہوں۔ تا کہ وہ تخلیہ میں آزادانہ اپنا کاروبار کر سکے۔ یا شاید وہ اپنا مال گروی رکھتے ہوئے جھجکتی تھی۔ اگرچہ اس کے پاس۔ گروی رکھنے کے لئے کوئی چیز دکھائی نہ دیتی تھی . . . . اس کے قدرے عمدگی سے تراشے ہوئے کسمسی لب پھڑکتے دکھائی دیتے تھے۔

اور اُس کی بے خواب اور بھاری آنکھیں بے قراری سے پپوٹوں میں حرکت کر رہی تھیں۔ پسینہ سے سفید ململ کا فراق اس کی پشت پر چمٹ گیا تھا۔ اور پشت کی جانب سے اس کی انگیا کے تناؤ کے ریشمی فیتے شانوں پر گول چکر کاٹتے ہوئے صاف دکھائی دے رہے تھے۔

"آج بہت گرمی ہے — توبہ! — شام کو ضرور بارش ہوگی۔"

اوسا کا فیئر کے منتظم نے کانوں کو چھوتے ہوئے کہا۔

نتھا رونے یہ بات نہ سنی۔ وہ بہت انہماک سے پان شاپ کے اندر دیکھتا رہا۔ پھر یکایک کانپتے ہوئے اٹھا اور بولا۔

اس سے تو میں بھو کا مرجانا پسند کرتا ہوں۔ . . ."

صمیم نے غور سے پان شاپ کے اندر دیکھا اور بولا۔

"ضرورت مجبور کرتی ہے میرے بھائی۔ وگرنہ کوئی خوشی سے تھوڑا ہی۔..."

لڑکی پان شاپ سے باہر آئی۔ اُس کے بُشرہ سے صاف عیاں تھا۔ کہ گرگروی مال پر اس کے اندازے اور ضرورت سے اُسے بہت ہی کم روپیہ ملا تھا۔ نہیں تو اطمینان اور خوشی کی نظر بر اُسکے چہرے پر ضرور دکھائی دیتی ..... وہ اپنے بیمار خاوند پر اپنا سب کچھ لٹا چکی تھی۔ اب اس کے پاس سنہری بالوں کے سوا گروی رکھنے کے لئے رہا ہی کیا تھا۔ کاش ان حلقے دار لمبی لمبی سنہری زلفوں کی ہندوستان میں کچھ قیمت ہوتی!

لڑکی نے اپنا داہاں ہاتھ اوپر اُٹھا کر ایک انگلی کو جڑھ سے مسلنا شروع کیا۔ انگلی پر ایک زرد سا حلقہ نظر آرہا تھا۔ آہ! نا معلوم کتنی ضرورت سے مجبور ہو کر اس نے اپنی عزیز ترین چیز، اپنی رومانوی حیاتِ معاشقہ کی آخری نشانی پان شاپ میں گروی رکھ دی تھی۔ اس نے اپنے "رنڈوے" ہاتھ سے اپنی سنہری زلفوں کو نفرت سے پیچھے ہٹا دیا۔ کیونکہ اُن کی کوئی قیمت نہ تھی۔ اور پان شاپ کے پہیئے دار تختوں میں کھڑیا مٹی سے صاف کیے ہوئے خوبصورت شیشوں میں اُس نے اپنے حسین چہرے کے دھندلے عکس کو دیکھا اور رونے لگی ..... کیونکہ وہ حُسن فروش نہ تھی۔

× × × × × × ×

لوہے کی ایک خوردبین نما نال میں نھارو گُرگس کے چند ہلکے سے محدّب شیشے ڈال کر نصف گھنٹہ کے قریب ایک بوڑھے کی آنکھوں کا معائنہ کرتا رہا۔ بوڑھے کے سامنے کچھ دُور ایک طاق کے ساتھ اردو کے حروفِ تہجی آویزاں تھے۔

نھارو بار بار اس نالی کی درز میں کسی نئے اور ہلکے سے محدّب شیشے کو رکھ دیتا۔ بوڑھا کہتا:۔

"اب 'م' تمہارے کوٹ سے بھی بڑی دکھائی دیتی ہے۔"

"اب 'ظ' سے شعاعیں سی نکل رہی ہیں۔"

"اب ع، دُھندلی دُھندلی اور پرچھائیں دار نظر آتی ہے۔"

"اب سب حروف دکھائی تو ٹھیک دیتے ہیں ــــ مگر بہت ہی چھوٹے چھوٹے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تمہارے کوٹ کے بٹن سے بھی چھوٹے۔"

وہ بوڑھا کیا جانے کہ اگر کسی محدب شیشے میں سے تمام حروف تہجی اپنے قد و قامت کے دکھائی دینے بھی لگیں ۔ تو بھی وہ نھارو لال ــــ جدید "عینک ساز" اور "فوٹو گرافر" سے ایک دیدہ زیب سیلولائیڈ کا فریم کیا ہوا چشمہ لگوا کر ہمیشہ کے لئے اندھا ہو جائے گا۔

ڈیڑھ گھنٹہ کی "سائنٹفک" دیکھ بھال کے بعد نھارو نے شیشے کا نمبر ایک کاغذ پر لکھا۔ اور عینک بوڑھے کو دیدی۔

بوڑھا ان امیر گاہکوں میں سے نہیں تھا۔ جو تھوڑے سے پیسوں کی ادائیگی کے لئے بھی بیکم کا وعدہ کیا کرتے ہیں۔ پیسے اس کی مٹھی میں تھے نھارو لال کے مانگنے پر اس نے چند پسینہ سے تر ا بور سکّے کونٹر پر بکھیر دیئے۔ ان سکوں کو دیکھنے سے گھن آتی تھی۔ نھارو نے ایک حریصانہ انداز سے سکے اٹھا کر اپنی جیب میں ڈال لئے اور اپنا ہاتھ پتلون سے پونچھنے لگا۔

نھارو نے ایک مغرورانہ انداز سے پان شاپ کی طرف دیکھا۔ ایک ادھیڑ عمر کا شریف آدمی جس کا منہ کان تک تمتما رہا تھا۔ آہستہ آہستہ پان شاپ کے سامنے کی تین سیڑھیوں سے نیچے اتر رہا تھا نیچے اترتے

ہوئے اُس نے پان شاپ کے بہیئے دار تختوں میں کھڑیا مٹی سے صاف کئے
ہوئے خوبصورت شیشوں میں سے اپنے پُر سنز افت چہرے کے دُھندلے
عکس کو دیکھا۔ اور بہت غمزدہ ہوگیا ـــــــ کیونکہ وہ بدمعاش نہیں تھا!
"پان شاپ کا مالک چار دن میں بھی اتنا سو و جمع نہیں کرسکتا" تھارو
نے اپنی جیب میں سکوں کی کھنکار پیدا کرتے ہوئے کہا۔
پھر تھارو ایک بے سُود بے حاصل غرور کے جذبہ کے ساتھ اُس
پاس کے دو کانداروں کی آمدنی کا اندازہ لگانے لگا۔
اِس لاحاصل جمع خرچ میں ہیگم بازار کے بساطیوں کا کوئی دخل نہ تھا
اُن کی آمدنی لامحدود تھی۔ اور تھارو کے محدود تخیّل سے بہت ہی پرے۔
ہاں! موجد "دافع چنبل و داد" کے نسخہ کی قیمت زیادہ سے زیادہ دو آنے
ہوگی۔ گندھک، رال، سہاگہ، پھٹکڑی ہر ایک حصہ اور نیلا تھوتھا ½ حصہ
اور ایک مخفی چیز جو اُس نسخہ کی کامیابی کی کلید ہے۔ اور جس نے اس عطار
کو موجد کا خطاب دیا ہے۔ وہ بھی ایک آدھ پیسہ میں آجاتی ہوگی ـــــــ
اس میں وہ کماتا کیا ہے؟ اوسا کا فیئر کے منتظم کو کمیشن بٹہ کی بنا پر ملتا ہی کیا
ہوگا؟ .... ہیئر کٹنگ سیلون والے فی حجامت چار آنے ....
پانچ آنے کما لیتے ہونگے ......
تھارو نے ایک دفعہ پھر چمکتی ہوئی آنکھوں سے پان شاپ کیطرت

دیکھا۔

اس کی پتلون کی جیب میں پسینہ سے تر اور سکے اس کی رانوں کو گیلے گیلے لگنے لگے۔

اس وقت ادسا کا فیئر کا منتظم آیا۔

ہفتہ بھر اس کی دوکان پہ سوائے پرچون کے چند گاہکوں کے اور کوئی نہ آیا تھا۔ دسہرہ، شب برات، یا دیوالی میں ابھی اڑھائی تین ماہ باقی تھے۔ کیا ادسا کا بڑا آفس اکتوبر تک انتظار کرے گا؟ صمیم (خانزادہ) کا چہرہ قدرے سیاہ ہوگیا تھا۔ اور اس کے گذشتہ ایک ڈیڑھ ہفتہ میں اتنے معمر دکھائی دینے کی کوئی خاص وجہ تھی۔

صمیم نے اپنے آپ کو آرام کرسی پر گرا دیا۔ نقار و بولا۔

"یہ پان شاپ کا کام.... ہمارے کاموں سے بیک وقت اچھا بھی ہے۔ اور بُرا بھی"

"اچھا کیسے؟"

"آمدنی ——— ہم کرکس کے چشمے اور فریم خریدتے ہیں۔ عکس لینے کے لئے منفی پلیٹیں اور مثبت کاغذ لاتے ہیں۔ کبھی کبھی ہمارا نقصان بھی ہو جاتا ہے۔ پان شاپ میں پلّے سے کیا خرچ کرنا پڑتا ہے۔ اگر کوئی میعاد کے بعد لی ہوئی رقم سے نگی رقم کی چیز چھڑانے نہ آسکے۔ تو سب کچھ اپنا

"...... اور ایک بڑا ساڈ کار۔"

"بُرا کیسے ؟"

"بُرا .... بُرا ؟ اس میں دھوکا کا خطرہ ہے۔ یہ لوگ دوسرے کا مال اپنے پاس گروی رکھتے ہوئے اور بغیر محسوس کئے ہوئے اپنا ضمیر اپنے گاہک کے سامنے گروی رکھ دیتے ہیں۔ اور یہاں سے کبھی کبھی کوئی حسین لڑکی اپنی رومانوی حیاتِ معاشقہ کی عزیز ترین اور آخری نشانی دیکر حسرت کے عالم میں اپنے رنڈوے ہاتھ کو مسلتی ہوئی چلی جاتی ہے۔ اگر ہمارے ہاں سنہری زلفوں کی کوئی قیمت ہو۔ تو یہ حریص آدمی ان کو بھی گروی رکھ لیا کریں۔ اگر کسی شریف ادھیڑ عمر کے آدمی کی شرافت بکاؤ ہو...... تو یہ لوگ اسے بھی گروی رکھنے سے گریز نہ کریں۔"

اور ٹھارو مسکرا کر غرور سے سکے اپنی جیب میں اچھالنے لگا۔

دو گھنٹہ سے ٹھارو نے چند منفی پلیٹیں برفیلے پانی میں ڈال رکھی تھیں اب وہ ان سے مثبت کاغذ پر عکس اتارنا چاہتا تھا۔ اُس نے پانی میں ہاتھ ڈال کر دیکھا۔ پانی گرم ہو چکا تھا۔ اور منفی پلیٹوں پر مصالحہ پگھل کر لاوہ کی صورت اختیار کر گیا تھا۔ ٹھارو کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

وہ کچھ نہ بولا...... وہ کچھ بول ہی نہ سکا۔

یہ اُسے چھ روپے کا نقصان تھا۔ ایک عینک کی بچت سے تین گنا

زیادہ نقصان۔

ٹھاردو ایک انگڑائی لے کر صمیم کے پاس بیٹھ گیا۔ اِسے یوں محسوس ہُوا جیسے ایک لمحہ میں اس کی سکت اس کے جسم سے کھینچ لی گئی ہو۔

ٹھاردو ٹکٹکی باندھ کر پان شاپ کی طرف دیکھنے لگا۔ شیشے کے پیچھے طلائی سیکنڈرس قانون و فقہ کی کتابوں پر لٹک رہی تھی۔ ایک کونے میں کانسی اور پیتل کے فلسطینی پیالوں کی شکل کے گلدستے اور لمبی لمبی ٹانگوں والے کلنگ پڑے تھے۔ فرنیچر کی دو قطاروں میں اخروٹ کی لکڑی میں کشمیری تراشش کا ایک بڑا سا گنیش بھی دکھائی دے رہا تھا۔ اور ایک دیوار کے ساتھ پان شاپ کا مالک ایک آہنی سیف پر اپنی کہنیاں رکھے . . . . .

× × × × × × ×

اوک پلائی کے ڈارک رُوم میں دم گھٹ جانے پر ٹھاردو نے ایک گہرا سانس لیا۔ اور پھر مثبت کاغذ پر نقش کو مستقل کرنے والے مرکب کو ہلاتا رہا۔ اُس وقت پسینہ اس کی کمر سے ہو کر گھٹنوں کی پشت پر قطرہ بہ قطرہ ٹپک رہا تھا۔

شاید ٹھاردو اوک پلائی کے ڈارک روم میں پگھل کر اپنی جان دیدیتا۔ اگر صمیم اوسا کا فیئر کو بند کرتے ہوئے اِدھر نہ آنکلتا۔ ٹھاردو نے صمیم کی آواز پر باہر آتے ہوئے آہستہ آہستہ اپنی قمیص اتاری۔ اس میں سے پسینہ نچوڑا

اور قمیص کو پانی کے ایک ٹب میں چھوڑ دیا۔ اور ہانپتے ہوئے بولا۔
"آج کل ایمانداری کے کام میں پڑا ہی کیا ہے؟ ..."
—— اور بین الاقوامی کاروبار کے شائق تھارو نے ایک پھٹی ہوئی بنیان آہستہ آہستہ سر سے نیچے اتار لی۔
پانی کے ٹب میں تھارو کی قمیص کی جیب میں سے کاغذ کا ایک پرزہ نکل کر پانی پہ تیرنے لگا۔ اس پر تحریر تھا۔ تین آنے کا مرکب، دو آنے یونین کا چندہ، ایک پیسے کی گنڈیریاں۔ کل سوا پانچ آنے۔
تھارو بولا "یہ میری تمام دن کی آمدنی اور خرچ ہے ....
تم مجھے کنوارا دیکھ کر مذاق کرتے ہو ... بیاہ ... محبت کتنی میٹھی چیز ہے۔ مگر خالی معدے میں تو پانی کی سی نعمت بھی جا کر تڑپا دیتی ہے"
اوساکا فیکٹری کا منتظم مبہوت بنا تھارو کے غمزدہ چہرے کے ٹیڑھے ٹیڑھے شکنوں کی طرف دیکھتا رہا۔ اور بولا ...
"تم ٹھیک کہتے ہو بھائی ... ایمانداری کے کام میں پڑا ہی کیا ہے ... اوساکا سے چھٹی آئی ہے۔ اگر چھ ماہ کے اندر نقشہ کیفیت میں آمدنی کی مد بھاری یا کم از کم خاطر خواہ دکھائی نہ دی تو یہ دوکان دہلی کے دفتر سے ملحق کر دی جائے گی"
چند لمحات کے لئے دونوں خاموش رہے۔ پھر تھارو بولا۔

"پان شاپ کا مالک دس سے لیکر ۱۲½ فیصدی تک فرنیچر پر دیئے
ہوئے روپیوں میں سے کاٹ لیتا ہے۔ عام طور پر نیشنل بنک اور بانسے کے
سونا پر ایک پیسہ فی روپیہ سود لیتے ہیں۔۔۔ مگر ادھر دیکھو حسینہ تصویر کیطرف
مت دیکھو۔ تمہیں وہ لڑکی یاد ہے نا؟ جس نے مجبوری اور حسرت کے عالم
میں اپنی عزیز ترین چیز پان شاپ کے مالک کو دے دی تھی۔۔۔ اس کی
انگشتری کی قیمت اسی روپے تھی۔"

خانزادہ اچھل پڑا۔۔۔ تھارو بولا۔۔

"پان شاپ کے مالک نے خود مجھے بتایا ہے۔۔۔ اس کی قیمت اس
نے تیس روپے ڈالی۔۔۔ صرف تیس۔۔۔ میں سچ کہتا ہوں تیس روپے
اور ایک آنہ فی روپیہ سود لگایا۔ میعاد ۳۱ اگست تک ہے۔۔۔ بکم بھی نہیں
۔۔۔ اس کے بعد وہ انگوٹھی اسی لٹیرے اور درندے کی ہوگی۔"
ایک چیتھڑے سے کسی تصویر کی پشت کو کبوتروں کی بیٹ سے صاف
کرتے ہوئے تھارو بولا۔

"میری جیب میں کچی کوڑی بھی نہیں۔۔۔ دوکان میں نہ منفی پلیٹیں
ہیں نہ مثبت کاغذ۔۔ ۲ بتی کی طاقت کا ایک بلب فیوز ہو گیا ہے میں
کام کیسے کر سکتا ہوں؟"

خانزادہ نے اوساکا سے آئی ہوئی چٹھی جیب سے نکالی اور شاید

دسویں بار اِسے پڑھنے لگا۔

کچھ دیر غور و فکر میں غرق رہنے کے بعد تھارو نے تصویر اور چیتھڑے کو میز پر رکھ دیا اور بولا۔

"بیگم بازار کی منحوس دوکان پھر اپنی دُکھ بھری کہانی کو دہرائیگی .... عنقریب ہی خالی ہوجائے گی۔ انٹرنیشنل فوٹوسٹوڈیو کا کام پیرٹ وگراڈ، ٹمبکٹو یا ہونولولو تک وسیع ہونا تو ایک طرف رہا وہ تو بیگم بازار سے نشیبی چوک تک بھی پہنچنے سے قاصر رہا .... اور کیا بھائی؟ .... آج کل ایمانداری کے کام میں رکھا ہی کیا ہے؟ ...."

صمیم نے سر اٹھا کر دیکھا۔ سامنے تھارو کھڑا تھا۔ تھارو، جس کا جسم و روح دونوں ارتقا پذیر ہو چکے تھے۔!

× × × × × × ×

پان شاپ کا مالک اور تھارو مقامی کاٹن مل کے ہڑتالی مزدوروں کا مظاہرہ دیکھ رہے تھے۔ یکایک پان شاپ کے مالک نے تھارو کو اندر لے جاکر ایک چھوٹا سا کاغذ سامنے رکھ دیا۔

تھارو کا چہرہ کان تک تمتما اٹھا۔ اس کی آنکھوں میں خون کے آنسو اتر آئے۔ ہکلاتے ہوئے اُس نے کہا۔

"دس فیصدی؟ د.... د.... دس فیصدی تو بہت ہے۔"

"نہیں یہ خاص رعایت ہے . . . . ورنہ بارہ سے کم نہیں۔"

"تم کنبرہ کو فرنیچر میں کیوں گنتے ہو؟"

"اور وہ زیورات میں بھی تو شمار نہیں ہو سکتا۔"

مٹھارو لال نے پھر ایک دفعہ کاغذ پر نظر ڈالی۔ اور اپنی شعلہ فگن آنکھوں کو اُوپر اُٹھاتے ہوئے کہا۔

"۳۱ راگست کو نہیں . . . تم مجھے لوٹنا چاہتے ہو . . . یکم کی شام تک۔ بابو لوگ یکم کو ہی پیسے دیتے ہیں۔"

"بات صرف یہ ہے۔ ۳۱ راگست کی رات کو میں شملہ جا رہا ہوں — ورنہ یکم ہو جاتی تو کیا پرواہ تھی . . . عموماً اس معاملہ میں گاہکوں کی رضامندی ہمیں مطلوب ہوتی ہے . . . مگر . . ."

مقامی کاٹن مل کے ہڑتالی مزدوروں کے ہجوم کو چیرتے ہوئے ایک شخص باہر نکلا۔ انگلی سے پیشانی پر سے پسینہ پونچھتے ہوئے اس نے پان ٹکٹ نکالی۔ اور بیالیس روپے پان شاپ کے مالک کی میز پر رکھ دیئے اور سنگر مشین چھڑوا کر اس تیزی سے بھاگا۔ کہ دھاگہ کی گولی دوکان کے اندر گر کر اس کے پیچھے پیچھے گھسٹتی ہوئی دروازے کی ایک درز میں ٹوٹ گئی۔

مٹھارو نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے کاغذ پر دستخط کر دیئے۔ پان شاپ کے مالک نے ایک ڈبیہ کو کھولتے اور بند کرتے ہوئے کہا۔

"ایک گواہی بھی ڈلوا دونا . . . جی جی . . . رسمیہ طور پر ضرورت ہوتی ہی ہے نا . . . جی جی . . ."

"گواہ کس کو لاؤں ؟"

" اوسا کا فیئر کے منتظم کو لے آؤ۔"

ٹھارو کے ہاتھ زیادہ کانپنے لگے۔ وہ بھی صمیم کی طرح معمر نظر آنے لگا ٹھارو کھنکارتے ہوئے بولا۔

" مگر میں صمیم کے سامنے روپیہ لینا نہیں چاہتا۔"

پان شاپ کا مالک ڈرامائی انداز سے ہنسنے لگا۔ ہنستے ہوئے اس نے سامنے لٹکتے ہوئے جھومروں کی طرف اشارہ کیا اور بولا۔

" وہ صمیم کی بیوی کے ہیں !"

اب ٹھارو نے جانا۔ کہ کیوں صمیم ایک ہفتہ میں ہی معمر دکھائی دینے لگا تھا۔ اس نے چپکے سے سند پر بھی دستخط کر دیئے۔ پان ٹکٹ ہاتھ میں لیا۔ اور کسی دوسرے دوکاندار کی گواہی ڈلوا دی۔

پھر وہ پان شاپ کے پہیّے دار تختوں میں کھڑیا مٹی سے صاف کئے ہوئے خوبصورت شیشوں میں اپنے معمر اور دبا نندا چہرے کے دھندلے عکس کو دیکھتے ہوئے پان شاپ کی سیڑھیوں پر سے اترا۔ اُس کی آنکھیں پُر نم ہو گئیں ——— کیونکہ وہ ایمان فروش اور

بدقماش نہیں تھا۔

۳۱ر اگست تک ٹھاکر وسوکھ کا کانٹا ہو گیا۔ وہ اس رسی کی مانند ہو گیا تھا۔ جو جل جانے کے بعد بھی ویسی ہی صورت رکھتی ہے اُسے کسی طرف سے آمدنی کی صورت نظر نہ آتی تھی۔ اس پر سکرات کی سی وہ کیفیت طاری ہو گئی۔ جب کہ آدمی مایوس ہو کر آسمان کی طرف سر اُٹھا دیتا ہے .... ایمان دار کی خدمت کرتا ہے ..... ایمان کی کمائی ...... ایمان کی کمائی میں برکت .... ایمان ..... لعنت! ....

ادسا کا فیر کا منتظم ٹھاکر و کے پاس آیا۔ مایوسی کے انداز سے اس سے اپنے آپ کو ایک کرسی پر گرا دیا اور بولا۔

"پان شاپ ... میں ایک کیمرہ دکھائی دیتا ہے"

ٹھاکر ولال نے شرمندہ ہو کر سر اُٹھایا۔ اور ایک گہری نظر سے پان شاپ میں دیکھتے ہوئے بولا۔

"ہاں ——— دکھائی دیتا ہے ... اور جھومروں کی ایک جوڑی بھی ..."

خان زادے نے ایک سرد آہ بھرتے ہوئے کہا "کتنی میعاد ہے؟"

"۳۱ر اگست ... اور تمہاری ؟"

"۳۱ر اگست"

"کوئی سبیل ؟"

"کوئی نہیں ... اور تمہاری ؟"

"اُوں ہُوں"

اور دونوں نے ایک سرد آہ بھرتے ہوئے سر گرا دیا ۔

منگل اشٹکا

منگل اشٹکا

۱۲ اکا زنک ـــــــ تلسی بیاہ کا تہوار تھا۔ اُسی دن نندہ اور وجے کا بیاہ ہوا۔

نندہ کے چہرے کی سپیدی اور سُرخی کسی رنگریز کے ناتجربہ کار شاگرد کے سُرخ رنگے ہوئے کپڑے کی مانند تھی۔ اور وہ کسی مستور جذبے سے سرتاپا کانپ رہی تھی۔ اگر اس خود فراموشی میں صرف اُسے اتنا سا خیال رہتا کہ وہ کہاں کھڑی ہے اور ایسی حالت میں اُسے کیا کرنا چاہیئے۔ تو وہ آنکھیں جھپکے بغیر ایک مسلسل نظر سے جیو ارام پر وہت کی آٹے سے کھینچی ہوئی لکیروں یا خوبصورت وجے کے گورے گورے پاؤں کی طرف نہ دیکھتی اور نہ ہی وہ پھیریاں لیتے ہوئے قدرے سیدھی کھڑی ہو جاتی۔ کیونکہ قد میں وہ کچھ لمبی تھی۔ اور سیدھی کھڑی ہونے سے وہ اپنے شوہر کے شانے سے بھی سر نکالتی تھی۔ بیاہ سے چند روز پہلے اُس کی ماں نے اُسے پھیری کے موقع پر جھک کر چلنے کی سخت تاکید کی تھی۔ مگر نندہ تو یہ بھی بھول چکی تھی۔ کہ بیاہ کے وقت اور بیاہ کے بعد جسمانی لحاظ سے ہی نہیں بلکہ ہر لحاظ سے اُسے اپنے شوہر سے نیچا ہو کر رہنا پڑے گا۔

وجے کی حرکات بہت حد تک اُس کی دلی کیفیت کی ترجمان تھیں۔ اس کی بے تاب امنگیں آنکھوں کے راستے سے نہایت آوارگی کے ساتھ پل پل کرنندہ کی گوری گوری کلائیوں اور جسم سے جس کا چھریرا پن سات پردوں میں ملبوس ہونے پر بھی دکھائی دے رہا تھا۔ بے محابا لپٹ رہی تھیں۔ کبھی کبھی وجے کسی گہرے خیال کے زیر اثر آنکھیں بند کر لیتا۔ جیسے مستقبل کی تمام مسرتیں سمٹ کر اس موجودہ لمحے میں مرکوز ہو رہی ہوں۔ اور جیوارام پردھت ان تمام جذبات کو بھانپنے کی کوشش کر رہا تھا۔

پنڈت جیوارام کے سامنے آج یہ تیسرا جوڑا تھا۔ جسے وہ رشتۂ ازدواج میں منسلک کر رہا تھا۔ جیوارام نے بیاہ کا ساتواں منتر پڑھا — منتر پڑھتے وقت اُسے ذہن استعمال کرنے کی ضرورت کم ہی محسوس ہوتی تھی۔ کیونکہ بچپن میں ہی جب ردی شنکر جیٹوپا دھیائے نے اُسے منتر پڑھائے تو اس نے سب کچھ صحیح طور پر ایسا رٹ لیا تھا کہ تلفظ درست کرنے، لہجہ سلجھانے، آواز کو اونچا نیچا کرنے اور سُر بدلنے کی گنجائش ہی نہ رہی تھی۔ یوں بھی یہ فن اسے ورثے میں ملا تھا۔ وہ ایک خود بخود حرکت کرنے والی مشین کی مانند باقاعدہ طور پر اور معین جگہ پر — یعنی منگل، سنیچر، گنیش سے منسوب خشک آٹے کے خانوں میں پیسے رکھواتا۔ یا سیندور اور چاول پھینکواتا اور ایسا کرنے میں اُس سے بھول

چوک کبھی نہ ہوتی۔

جیسے دو اور دو چار ہوتے ہیں۔ ایسی صحت سے وہ تمام ضروری رسوم سرانجام دیتے ہوئے تخیل میں کہیں کا کہیں پہنچ جاتا۔ اُس دن وہ محسوس کر رہا تھا کہ وہ ایک اونچی پہاڑی پر کھڑا ہے۔ پہاڑی کے دامن میں اُس کو ایک خوبصورت جھیل ـــــ اس میں تیرتے ہوئے بجرے، اُس کے کنارے پر لہلہاتی ہوئی کھیتیاں اور ساتھ ہی ماہی گیروں اور دہقانوں کے وہ جھونپڑے نظر آرہے تھے جن میں وہ لوگ ایسی مسرت سے سرشار تھے جس پر بادشاہوں کو بھی رشک آئے اور اس سے پرے امراء کے محل جن میں وہ اپنے زر و دولت اور شان و شوکت کے باوجود غریبوں سے بھی زیادہ دکھی تھے۔ جھیل کے مشرقی کناروں پر پانی میں ناگ پھنی اور کنول اُگ رہے تھے۔ اور شیشم کے ایک کمزور سے درخت کے نیچے کوئی تارک الدنیا، سنیاسی ترئی پھونک رہا تھا اور ترئی کی دلکش آواز اُس بات کی یاد دلا رہی تھی۔ جیسے نسل انسان ازل سے بھولتی چلی آرہی ہے . . . .
. . . . اور پھر جیوا رام نے ایک گہری اور ٹھنڈی سانس لی۔ اب اُس نے دل میں کہا "ان ہاتھوں سے سینکڑوں بیاہ رچے۔ ان ہاتھوں نے سینکڑوں گھر آباد کیے، کتی عمر دوں کا ایک ایک لمحہ انبساط و نشاط میں سمو دیا۔ مگر میں خود ویسے کا ویسا کنوارا، خانہ برباد اور تنہائی کی ختم نہ ہونے

والی مصیبت میں گرفتار رہا۔ اس ناگ پھنی اور کنول کی مانند جو پانی میں اُگتے ہیں۔ مگر پانی سے آلودہ نہیں ہوتے۔

اچانک اُسے خیال آیا کہ وہ بیاہ کا آخری منتر ــــــ منگل اشٹکا پڑھ رہا ہے اور پھر اشٹکا کا بھی آخری لفظ۔

"ساودھان" اُس نے خود کو کہتے ہوئے پایا۔

ساودھان کے لفظ کے ساتھ بیاہ مکمل ہو جاتا ہے۔ ہر طرف سے مبارکباد کی آوازیں آنے لگیں۔ اور اس شور و غوغا نے جیوارام کی توجہ کو اپنی طرف مائل کر لیا۔

"ساودھان" ــــــ جیوارام نے ایک دفعہ پھر کہا۔ اور . . . . . تیسرا بیاہ پڑھنے کے بعد جیوارام پنڈت کچھ تھکن سی محسوس کرنے لگا۔ آمدنی کا لالچ کم ہی اُسے اتنی محنت پر مجبور کیا کرتا تھا۔ جیوارام نے اپنی بوجھل آنکھیں اُوپر اٹھائیں۔ آنکھوں کے نیچے بھاری بھاری تھیلے زیادہ بھاری اور سیاہ دکھائی دینے لگے۔ تھیلوں کو سکیڑ کر جیوارام نے ایک جمائی لی۔ نندہ کو منہ بسورتے دیکھا۔ کیونکہ وہ اپنے ماں باپ سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو رہی تھی۔ اور روجے کو مسکراتے ہوئے کیونکہ عنقریب وہ شادی کی مسرتوں سے لطف اندوز ہونے والا تھا۔ کئی جمائیوں کے درمیان پروہت نے نہایت اختصار سے نندہ اور روجے کو خاوند اور بیوی کے جداگانہ فرائض سے آشنا کیا۔

اُس کی تقریر کا لُبِ لباب یہ تھا کہ وہ آگ، پانی، ہوا، زمین اور آسمان کی گواہی میں ایک کئے جاتے ہیں۔ نندہ کو بتایا گیا کہ وہ ہر لحاظ سے شوہر سے کم رتبہ رکھتی ہے (اگرچہ جسمانی لحاظ سے وہ شوہر سے سر نکالتی ہے ——) وجے سے کہا گیا کہ اُسے چاہیئے کہ وہ نندہ کو اپنے گھر کی رانی بنا کر رکھے۔ پھر جیوارام نے وجے کو خاص طور پر برہمن، استری اور گائے کی حفاظت کرنے کی تلقین کی شیوا نز کی کتھا کا ایک حصہ سناتے ہوئے جیوارام نے کہا۔

. . . . وجے تم بھی پنڈت ہو۔ تم خود جانتے ہو گے۔ شکاری جو تیر مارنا چاہتا تھا اُسے جانوروں نے اپدیش دیا۔

۱۰ بکریوں کا مارنا برابر ہے	ایک بیل مارنے کے
۱۰۰ آدمیوں کا مارنا برابر ہے	ایک براہمن کو مارنے کے
۱۰۰ براہمنوں کا مارنا برابر ہے	ایک استری کو مارنے کے
۱۰۰۰ استریوں کا مارنا برابر ہے	ایک گربھ وتی (حاملہ) استری کو مارنے کے
۱۰ گربھ وتی استریوں کا مارنا برابر ہے	ایک گائے مارنے کے . . . .

(۲)

اپنا کام نمٹا چکنے کے بعد جیوارام نے وہاں سے ٹلنا چاہا کس لئے؟ پھر تنہائی کی ختم نہ ہونے والی مصیبت میں گرفتار ہونے کے لئے، ویسا ہی

برباد، کنوارا اور اچھوتا رہنے کے لئے جیسے سخت بارش کے بعد ناگ پھنی اور کنول بن بھیگے سر اٹھائیں۔ اتنے بیاہ اس کے ہاتھوں سے ہوئے۔ بیاہوں کی اس موسلا دھار بارش میں بھی وہ ناگ پھنی کی مانند . . . .

اس وقت جیوارام کے تصور میں نندہ کا بھول نہ سکنے والا چہرہ وجے کی اوباش و آوارہ نگاہیں اور کانوں میں براتیوں کا شور و غوغا گانے اور ہنسی مذاق کی آوازیں تھیں۔ اس کی جذباتی طبیعت درحقیقت اُسے وہاں سے رخصت ہو جانے پر مجبور کر رہی تھی۔

وہ طبیعت کیسی تھی؟ ——— بات یہ تھی کہ سخت جذباتی ہونے کی وجہ سے وہ باجے، ڈھولک، گانے، مذاق اور چٹکیوں کی تاب نہ لا سکتا تھا۔ بیاہ کے موقعہ پر دلہن کے چہرے کا حیا سے رنگ بدلنا، نوشہ کی دزدیدہ نگاہیں، رخصت ہوتے وقت دلہن کا رونا، راگ رنگ، ہنسی اور قہقہے اس کے دل میں ایک ہیجان بپا کر دیتے۔

خصوصاً بیاہ کے گیت سن کر تو اُس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگ جاتا۔ اور اپنے شدید کنوارے پن میں اُسے یہ محسوس ہونے لگ جاتا کہ وہ اس تمام شور و غوغا میں ایک ادنے، بے توقیر اور فالتو فالتو سی شخصیت ہے۔ اُس کا یہ وہم دیوانگی کی حد تک پہنچ چکا تھا منگل اشٹکا پڑھنے اور ساودھان کہہ چکنے کے بعد وہ فوراً ایک کونے کی طرف سرکنا شروع کر دیتا

جوں جوں دلہن والے اور براتی اُس کی فوری کنارہ کشی دیکھتے توں توں اُسے بیٹھنے کے لئے جگہ دیتے۔ نہایت تکریم سے بلاتے۔ مگر جس قدر کوئی اصرار کرتا۔ جیوارام کو اسی قدر زیادہ خفّت ہوتی۔

ایک اور بات سے بھی اس کا اس قدر شرمیلا ہونا منسوب کیا جا سکتا تھا۔ شروع سال میں باتوں باتوں میں جیوارام نے مجھے بتایا کہ اُس سال چیت کی پورنماشی کو ہنومان جینتی کے دن وہ چالیسویں سال میں قدم رکھے گا۔ یکایک مجھے خیال آیا کہ چیت کی پورنماشی کے دن ماروتی دیو یعنی ہنومان جی پیدا ہوئے تھے اور اُس دن سے چالیس برس پہلے جیوارام کی پیدائش بھی انہیں ستاروں کے زیر اثر ہوئی ہوگی جس کے باعث اس کا جسم بھی تنومند تھا اور طبیعت میں ہنومان جی کی سی بے چینی اور جوش بھی تھا۔ یعنی وہ ایک جگہ جم کر کم ہی بیٹھ سکتے تھے۔ فقط ایک بات تھی۔ جو ہنومان جی میں نہ تھی اور وہ جیوارام میں تھی۔ اور وہ جیوارام کا شرمیلاپن اور غیر ضروری حجاب تھا۔ ہو سکتا ہے کہ ہنومان جی کی پیدائش اور پنڈت جیوارام کی پیدائش میں کچھ وقت کا فرق پڑ گیا ہو اور جیوارام دوسری راس میں داخل ہو کر ہنومان جی سے تفریق پیدا کر چکا ہو اور کسی کمزور ستارے نے ہنومان جی کی سی بے باکی اور جرأت کو شرمیلے پن اور محجوبی میں بدل دیا ہو۔ بہر حال وہ اُس وجہ سے بھی

شرمیلا تھا کہ برسوں سے اکیلا رہتا آیا تھا۔ عمر کے چالیسویں سال میں قدم رکھتے ہوئے وہ اس خوفناک طور پر کنوارا تھا۔ کہ اگر بیمار پڑ جائے تو کوئی اُسے پانی کو بھی نہ پوچھے۔

چونکہ عورتوں کی بابت وہ کچھ نہیں جانتا تھا۔ اس لئے وہ اُن سے کچھ ڈرتا بھی تھا۔ وہ صرف یہی جانتا تھا۔ کہ دنیا میں بہت سے جھگڑوں کی ابتدا، عورت سے ہوا کرتی ہے۔ اس بات کا بھی اُسے علم تھا کہ عورت کی طبیعت (اس کی اپنی طبیعت کی مانند) جذباتی ہوتی ہے۔ مبہم اور شرمیلی —— نامعلوم کس وقت کوئی بات اُسے بُری لگ جائے حالانکہ اس میں ذرہ بھر شک نہیں کہ جیوا رام بری بات کے معیار سے ناواقف تھا۔ بیسیوں بار اس نے جی کڑا کر کے ایسی باتیں جو اس نے پہلے دل میں بُری محسوس کیں۔ کہہ دیں۔ مگر کسی عورت نے بُرا نہ مانا۔ اور اب تو اس کی ہمت بڑھتی جاتی تھی۔

بیس برس سے چالیس برس کی عمر کے درمیان اُسے خیال آیا کہ وہ برہمچریہ آشرم سے گرہست آشرم میں داخل ہو جائے۔ مگر برہمچاری پنڈت کا درجہ سماج میں کتنا اونچا ہوتا ہے۔ اُس کا اُسے غرور تھا محض انگشت نمائی کے خوف سے اُس نے اپنے آپ کو روکے رکھا۔ حتیٰ کہ چالیس برس کی عمر کو پہنچنے تک یہ خیال بہت شکستہ ہو گیا تھا کہیں تخیل انگیز

بیاہیوں نے اس کی ہٹ پر کاری ضرب لگائی تھی اور رفتہ اُس کے یہ ذہن نشین ہوگیا۔ کہ چلتی پھرتی دنیا میں کسی کو اتنی فرصت نہیں ہوتی کہ وہ اپنا کام کاج چھوڑ چھاڑ کر انگشت نمائی کے لئے وقت نکالے ایسا خیال کرنا تو اپنے ہی من کی مایا ہے . . .

گرہست کے قضیوں کا رونا اگرچہ رُلنا شہر کے متعدد گرہستیوں سے انفرادی طور پر سنتے سنتے اس کے کان پک چکے تھے۔ پھر بھی کسی ہوشربا بیاہ کے اختتام پر ایک وقفہ حیرت میں ڈوبے رہنے کے بعد جیوارام منہ سے انگلی نکال کر سر کو ایک جھٹکا دیتا۔ جیسے کسی وکیل کو اپنے موکل کے بیان میں کوئی ایسا موافق نکتہ دکھائی دے جس پر تمام مقدمہ گھوم جائے۔ وہ مشکوک انداز سے کہتا۔

”یہاں —— یہ بات۔ بھئی! آخر کچھ تو ہے۔ جو رو نے پیٹنے کے باوجود لوگ خوش رہتے ہیں۔ اس کش مکش اور بے قراری میں بھی کچھ نہ کچھ لطف ضرور ہے . . .“

مگر جب جیوارام کے کان میں یہ الفاظ پڑتے کہ جیوارام چالیس برس کا ہو چکا ہے اور اُس نے ابھی استری کا منہ تک نہیں دیکھا“ تو جیوارام کو اپنی فوقیت اور فضیلت میں شک نہ رہتا۔ ایسی بات سن کر جیوارام کے خوش آیند تخیل کی بنائی ہوئی بیاہ کی حسین عمارت ملبہ

سمیت نیچے آ رہتی اور اسے از سر نو اور زیادہ وسیع اور شاندار بنانے کے لئے ایک ہوش ربا بیاہ، اُس کی تمام رونق ازدواجی رشتوں میں منسلک ہونے والے لڑکی اور لڑکے کی غائبانہ کشش، اُن کے والدین کی خوشی، اُسی راگ رنگ، اور ہنگامۂ ہاؤ ہو کی ضرورت ہوتی ——— اور نندہ اور دجے کا بیاہ پڑھ چکنے کے بعد ایک ایسی تعمیر کے کنگرے جیوارام کے تخیل میں آسمان سے باتیں کر رہے تھے۔

(۳)

چند دنوں کے بعد او باش دجے جو رُلنا میں ہی رہتا تھا۔ اور دور نزدیک سے جیوارام کا رشتہ دار بھی تھا، آیا۔ اُس کی آنکھوں کے سُرخ ڈورے زیادہ پھول رہے تھے اور اُن سے شعلے نکلتے دکھائی دیتے تھے جیسے اُس کے اندر کوئی بھٹی جل رہی ہو۔ ہاں! شباب کی بھٹی تھی نادہ ———

ع ہے شباب اپنے لہو کی آگ میں جلنے کا نام۔

دجے نے کنوئیں کی چرخی کا سہارا لیتے ہوئے جیوارام سے کہا۔

"کہو دادا (بھائی) اتنے اداس کیوں ہو؟"

جیوارام نے اپنی افسردگی کو چھپا لیا اور بولا۔

"بھئی کل سے بیمار ہوں۔ بہت لاچار ہوں . . . . . . بھائی

کو خط لکھا ہے۔ بھاوج کو یہاں بھیجدے۔ مجھے تو یہاں پانی دینے والا بھی کوئی نہیں "

" ارے بھاوج؟ —— ایک ہی کہی تم نے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ دہانوں کے دن ہیں ۔ آج کل چھٹائی میں سر دھنتی ہوگی۔ جیٹھو کی کمائی انہیں تک تو محدود ہے۔ اور آج کل تو بھاؤ پھلانگتا ہؤا اوپر جا رہا ہے۔ ایک پانی برس گیا تو اُن کے کوڑی دام نہیں "

دور سے نیل رتن آتا دکھائی دیا۔ نیل رتن مجسم شیطان تھا۔ وہ ہمیشہ بے وجہ ہنستا تھا۔ بے موقع ہنسی مذاق کیا کرتا۔ جب لوگ ہنستے تو وہ روتا۔ جب لوگ روتے تو وہ ہنستا۔ یہ تعریف اولیاء کی ہوتی ہے مگر وہ ولی بھی تو نہ تھا۔ اور یہی بات خطرناک تھی۔

نیل رتن سے ذکر کیا گیا تو وہ بولا۔

" ٹھیک ہے بھاوج کو غرض پڑی ہے کہ تمہارے ہاں آئے اُس کے تین بچے ہیں، تینوں کمسن، تینوں لڑکیاں۔ جن کا تن ڈھانپتے ہی آدھا دن گذر جاتا ہے —— بھلا آئے تو ایک ایک کٹوری سے کم دودھ کسی کو کیا دوگے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کیا کہتے ہو سیر؟ ۔ ۔ ۔ ۔ ایں؟ ۔ ۔ ۔ ۔ میں کہتا ہوں دو اڑھائی سیر سے کم نہ لگے گا۔ ذرہ حساب تو لگاؤ ۔ ۔ ۔ ۔ اور پھر کئی قسم کا خرچ آپڑے گا۔ یوں دبو گے جیسے چوہا بلی کے نیچے دبا ہوتا ہے "

پھر اس بات کا رخ خود بخود پلٹ گیا نیل رتن بولا۔
"کیوں وجے ـــــ بیاہ کیسا رہا۔ بیوی تو اچھی ہے نا؟"
جیوا رام نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔
"بھئی نندہ تو یوں بھی دیوی ہے ـــــ نری دیوی، وہ جہاں بھی جاتی گھر کو سورگ بنا دیتی"
"ٹھیک کہتے ہو دادا" وجے نے کنوئیں کی چرخی کا سہارا اٹھاتے ہوئے کہا۔
"گرہست تو سچ مچ سورگ ہوتا ہے۔۔۔ کیا بتاؤں، نندہ تو سچ مچ نندہ ہی ہے۔۔۔ میں نے پچھلے جنم میں کوئی اچھے کرم کئے ہونگے جو مجھے نندہ ملی۔۔۔۔ ایشور کرے میرے ایسا سکھ ہر ایک کو نصیب ہو"
اس کے بعد وجے نے اپنے آپ بتایا کہ نندہ اس وقت تک کھانا نہیں کھاتی۔ جب تک اسے نہ کھلائے۔ وہ کہیں باہر چلا جائے تو تمام دن انتظار ہوا کرتا ہے۔۔۔ دیر لگا کر آئے تو اسے روتا ہوا پاتا ہے شکوے ہوتے ہیں۔ رات کو سونے سے پہلے اس کے پاؤں دباتی ہے وغیرہ وغیرہ۔ شاید یہ خوش ہونے کی بات تھی۔ اسی لئے نیل رتن نے افسردہ سا منہ بناتے ہوئے کہا۔
"ایسا ہی ہوتا ہے بیٹا جی ـــــ چند روز ـــــ ذرا ایک دو

برس گزرنے دو . . . . . ایک آدھ بچہ ہو جائے گا۔ پھر دیکھنا یہ گرہست کس بھاؤ پڑتا ہے . . . . کدھر جاتے ہیں وہ چوچلے۔"

"خیر کچھ بھی ہو جیوا رام نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔" جس گھر میں نندہ سی بیوی چلی جائے . . . . وہ گھر تو . . . . "

پھر نامعلوم جیوا رام کو کیا ہوا۔ فوراً ہی مغموم سا منہ بناتے ہوئے بولا۔

" وہ زندگی ہماری طرح تو نہیں کہ بیمار پڑ گئے تو کوئی پانی بھی نہ پوچھے۔ بھاوج کو لکھیں تو وہ دھانوں یا بچوں کی وجہ سے نہ آئے۔ اگر آئے تو دو اڑھائی سیر دودھ وغیرہ ——— یہی اندازہ تھا نا رتن؟"

وجے اور نیل رتن نے شدید طور پر جیوا رام پنڈت کی مصیبت کو محسوس کیا۔ نیل رتن نے ایک خاص انداز سے وجے کی طرف دیکھا۔ وجے بولا۔

"دادا تم جانتے ہو۔ میں کس لئے تمہارے پاس آیا ہوں ؟"

"نہیں ——— میں کیا جانوں"

"میں تم سے منگل اشٹکا سیکھنے آیا ہوں، باقی کے سات منتر تو مجھے آتے ہیں منگل اشٹکا پڑھتے وقت کچھ روانی نہیں پاتا ہوں۔"

"تم بھی پروہتوں کا کام کرنے لگے . . . . اپنا کام چھوڑ دیا تم نے؟"

"تمہیں سکھا دینے میں تامل ہی کیا ہے ۔ ایک خاص بیاہ پر ضرورت ہے . . ."

پھر جیوارام کے قریب آتے ہوئے وجے نے کہا۔

"دادا! بات یہ ہے ۔ ہمارے ہاتھ تلے ایک لڑکی ہے . . . . . نہایت سندر، ذرا چنچل ہے . . . . تمہاری طرح ــــ عورتیں ہوتی ہی ہیں ۔ ہم چاہتے ہیں ۔ تمہارا اُس سے بیاہ ہو جائے ۔ بیاہ میں ہی پڑھ دوں ۔ اور زیادہ لاگ لپیٹ اور شور نہ ہو . . . . . گرہست میں تمہیں بہت سکھ ملے گا ۔ تمہاری حالت کا اندازہ میں نے اُسی دن لگا لیا تھا ۔ جب تم میرا بیاہ پڑھ رہے تھے۔"

وجے اور نیل رتن جیوارام کے اثبات و نفی کا انتظار کرنے لگے چند لمحات کے لئے خاموشی رہی ۔

جیوارام کا جواب خاموشی تھا ۔ جس کا مطلب تھا نیم رضامندی نیل رتن نے چپکے سے کہا ۔

"دادا ــــ اچھی بات ہے ۔ وجے پنڈت ہی ہے نا ۔ وہ منگل اشٹکا دنشٹکا پڑھ لے گا ۔ بہت شور مچائے بغیر بیاہ ہو جائے گا ۔ سکھی رہو گے تم جانو تمہارا کام . . . . . ہم بھلے کی کہتے ہیں ــــ دن منت دیکھو ۔ ۲۵ر کا رنگ ۔ بدھ وار ، شبھ لگن ، شبھ مہورت ، بس منگل اشٹکا

اورسا وہ ہان۔"

ناگ پھنی اور کنول کو اپنی پتیاں بھیگتی ہوئی نظر آنے لگیں، جیوارام کی ذہنی تعمیر کے کنگرے آسمان سے باتیں کرتے کرتے بالکل آسمان سے جا ملے۔

(۴)

جیوارام پروہت کے بیاہ کے لئے بہت ٹھاٹھ باٹھ کیا گیا۔ باجے بھی بجے اور ڈھولک بھی۔ مذاق بھی ہوئے اور قہقہے بھی بلند ہوئے اور جیوارام کا دل بھی دھڑکا ——— اور بہت زور زور سے۔ فقط اتنی کسر تھی کہ چھاتی کی دیواریں نہ ہوتیں تو کبھی کا اچک کر باہر آ رہتا۔

وجے نے دیکھا۔ پنڈت جیوارام کی نظریں بھی آوارہ ہو چکی تھیں اور مچل مچل کر اپنی ہونے والی بیوی کی گوری گوری کلائی پر چمکتی ہوئی چوڑیوں اور جسم جس کا چھریرا پن سات کپڑوں میں ملبوس ہونے پر بھی دکھائی دے رہا تھا۔ جائزہ لے رہی تھیں اس کی زوجہ بھی نندہ کی طرح لمبی تھی۔ اور اپنے شوہر سے سر نکالتی تھی اور یہ محض اتفاق کی بات تھی۔

وجے نے رسمیہ طور پر عہد کے لئے جیوارام کا ہاتھ اس کی ہونے والی بیوی کے ہاتھ میں دیا۔ اس پر گیلا آٹا رکھا اور ساتواں منتر پڑھ دیا۔

چاروں طرف سے چاول وجے کے آگے گرنے لگے۔

وجے ایک استادانہ طرز سے پیسے منگل سنیچر گنیش وغیرہ کے خانوں میں رکھوا رہا تھا۔ کانپتے ہوئے جیوا رام نے اشارہ سے وجے کو بلایا منتر گنگناتے ہوئے وجے نے اپنا کان جیوا رام کے منہ کے پاس کر دیا۔ جیوا رام نے کہا۔

"بھیا ——— میرا دل بہت دھڑک رہا ہے ..... میں کانپ رہا ہوں۔ دیکھتے نہیں مجھے سردی لگ رہی ہے۔ نیل رتن سے کہنا مجھے ذرا تھامے رکھے۔"

وجے برابر منتر گنگناتا گیا۔ وجے کا ایک اور ساتھی بولا۔

"دادا ——— نیل رتن گیر ہٹ گیا ہے ..... تم جانتے ہو ٹلنا سے بہت دور نہیں۔ آتا ہی ہوگا۔"

"وجے ——— ٹھہرو۔" جیوا رام نے آہستہ سے کہا۔ "منگل اشٹکا ابھی نہ پڑھو۔ مجھے سوچ لینے دو۔ میری عمر چالیس برس کی ہے۔ اور میں کیسا ہی پنڈت ہوں ....."

وجے نے دیکھا۔ جیوا رام سچ مچ بیاہ کے لئے بہت معمر تھا۔ اس کے گلے میں خشکی پیدا ہو رہی تھی۔ لب سوکھ گئے تھے۔ جن پر جیوا رام دیوانہ وار زبان پھیر رہا تھا۔

دبجے نے آہستہ۔۔۔۔مگر ایک حقارت آمیز آواز سے جیوارام سے کہا۔

"چھی چھی —— تمہارے ایسے کمزور آدمیوں کے لئے اس دنیا میں کوئی جگہ نہیں دادا —— دنیا ایسے لوگوں کا مذاق اڑایا کرتی ہے۔"

جیوارام کے بس کی بات ہوتی تو وہ منگل اشٹکا کا جاپ ہونے سے پہلے ہی اپنے پاک برہمچریہ کو گرہست کی آلودگیوں سے بچا لے نکلتا۔ مگر اس نے دیکھا کہ اس کے کانپتے ہوئے ہاتھوں کو اس کی ہونیوالی بیوی نے بہت زور سے دبا رکھا تھا۔ شاید وہ سوچتی تھی کہ وہ ہاتھ کیوں کانپ رہے ہیں؟ ۔۔۔۔۔۔ شاید شرارت کے طور پر —— چنچل تھی نا —— جوانی تھی نا —— عورت!

پھر جیوارام منگل اشٹکا کے جلدی جلدی پڑھے جانے کا انتظار کرنے لگا۔ تاکہ وہ جلد ہی اُس ذہنی کوفت سے نجات حاصل کرے۔ اور اپنی ہونے والی بیوی کا چہرہ دیکھے۔ اس کے تخیل کی مشین چلنے لگی۔ پھر اُس نے محسوس کیا کہ وہ ایک دلفریب پہاڑی پر کھڑا ہے۔ پہاڑی کے دامن میں اُس کو ایک خوبصورت نیلی جھیل —— اس میں تیرتے ہوئے بجرے، اس کے کنارے پر لہلہاتی ہوئی کھیتیاں، اور ساتھ ہی ماہی گیروں

اور دہقانوں کے وہ جھونپڑے نظر آرہے تھے۔ جن میں وہ لوگ ایسی مسرّت سے سرشار تھے جس پر بادشاہوں کو بھی رشک آئے۔ اور ان سے پرے امراء کے محل جن میں وہ زر و دولت اور شان و شوکت کے باوجود غریبوں سے بھی زیادہ دکھی تھے جھیل کے مشرقی کناروں پر پانی میں ناگ پھنی اور کنول اُگ رہے تھے۔ اور شیشم کے ایک بوڑھے سے درخت کے نیچے کوئی تارک الدنیا سنیاسی ترئی پھونک رہا تھا۔ اور ترئی کی دلکش آواز اس بات کی یاد دلا رہی تھی۔ جسے نسلِ انسان ازل سے بھولتی چلی آرہی ہے۔ ۔ ۔ ۔

——— فقط اب وہ اکیلا نہ تھا۔ اس کی بیوی بھی اس کے بازو میں بازو ڈالے محوِ نظارہ تھی۔

پانی میں ناگ پھنی اور کنول تر بتر ہو رہے تھے۔

یکایک منگل اشٹکا نے اُس کی توجہ اپنی طرف کھینچ لی۔ کتنا خوبصورت پُرمعنی منتر ہمارے بزرگوں نے۔ ۔ ۔ ۔

'ساودھان' کی آواز آئی اور لوگوں نے مبارکباد دی۔

وجے نے اپدیش دیا۔ بالکل جیو ارام کی طرح ——— وجے نے آخر میں کہا۔

۱۰ بکریوں کا مارنا برابر ہے ایک بیل مارنے کے

۱۰۰ آدمیوں کا مارنا برابر ہے ایک براہمن کے مارنے کے۔

پاس ہی سے ایک شرارتی لڑکے نے آہستہ سے کہا۔

ایک من برابر ہے چالیس سیر کے

ایک سیر برابر ہے سولہ چھٹانک کے

اور وجے نے گھورتے ہوئے کہا "ہشت ہشت"

× × × × × × ×

شام کو حجلۂ عروسی میں جیوا رام نے اپنی دلہن کو گٹھڑی بنے ایک کونے میں بیٹھے دیکھا۔

جیوا رام کا دل بلیوں اچھلنے لگا۔ اپنی بیوی کا منہ دیکھنے کی اس میں جرأت نہ تھی۔

"شاید یہ حرکت اُسے بری لگے —— جیوا رام نے دل میں کہا۔ "عورت ہے نا . . ."

جیوا رام نے جتنی دفعہ کوشش کی۔ اتنی دفعہ ہی ناکام رہا۔ اُسے یہ محسوس ہونے لگا۔ جیسے اُس کے کمرے میں اور بھی بہت سے آدمی ہیں۔ اُسے واہمہ گردانتے ہوئے جیوا رام نے اپنا ہاتھ بڑھایا۔ مگر پھر روک لیا۔

"تمہارے ایسی کمزور طبیعت والے آدمی کو تو دنیا آڑے ہاتھوں لیتی ہے . . . چھی چھی ——" وجے کے الفاظ جیوا رام کے کانوں

میں گونجنے لگے۔

جیوارام نے جب نہایت ہمت سے کام لے کر آناً فاناً دلہن کا منہ بے نقاب کیا تو دلہن دیوانی ہوکر تالیاں بجانے لگی۔ جیوارام کی آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا۔ اُسنے دیکھا کہ بیاہا ہوتے ہوئے بھی وہ کنوارا تھا۔ یا کنوارا ہوتے ہوئے وہ رنڈوا تھا یا . . . . ‘‘

—— دور چارپائی پر دلہن کی بجائے نہایت قیمتی کپڑوں میں ملبوس نیل رتن تالیاں بجا رہا تھا۔ اور باہر سے منگل انشٹکا کے اونچے اونچے جاپ کے درمیان بے تحاشا قہقہے بلند ہو رہے تھے!!

کوارنٹین

کوارنٹین

پلیگ اور کوارنٹین!

ہمالہ کے پاؤں میں لیٹے ہوئے میدانوں پر پھیل کر ہر ایک چیز کو دھندلا بنا دینے والی کہرے کے مانند پلیگ کے خوف نے چاروں طرف اپنا تسلّط جما لیا تھا۔ شہر کا بچہ بچہ اس کا نام سُنکر کانپ جاتا تھا۔

پلیگ تو خوفناک تھی ہی، مگر کوارنٹین اُس سے بھی زیادہ خوفناک تھی۔ لوگ پلیگ سے اتنے ہراساں نہیں تھے جتنے کوارنٹین سے اور یہی وجہ تھی کہ افسرانِ محکمۂ حفظانِ صحت نے شہریوں کو چوہوں سے بچنے کی تلقین کرنے کے لئے جو قدِ آدم اشتہار چھپوا کر دروازوں، گزرگاہوں اور شاہراہوں پر لگایا تھا اُس پر "نہ چوہا نہ پلیگ" کے عنوان میں اضافہ کرتے ہوئے "نہ چوہا نہ پلیگ، نہ کوارنٹین" لکھا تھا۔

کوارنٹین کے متعلق لوگوں کا خوف بجا تھا۔ بحیثیت ایک ڈاکٹر کے میری رائے نہایت مستند ہے اور میں دعوے سے کہتا ہوں کہ جتنی اموات شہر میں کوارنٹین سے ہوئیں اتنی پلیگ سے نہ ہوئیں۔ حالانکہ کوارنٹین کوئی بیماری نہیں۔ بلکہ وہ اُس وسیع رقبہ کا نام ہے۔ جس میں متعدی وبا

کے ایّام میں بیمار لوگوں کو تندرست انسانوں سے از روئے قانون علیحدہ کر کے لاڈواتے ہیں۔ تاکہ بیماری بڑھنے نہ پائے۔ اگرچہ کوارنٹین میں ڈاکٹروں اور نرسوں کا بندوبست تھا، مگر مریضوں کے کثرت سے وہاں آجانے پر اُن کی طرف فرداً فرداً توجہ نہ دی جاسکتی تھی۔ خویش واقارب کے قریب نہ ہونے سے میں نے بہت سے مریضوں کو بے حوصلہ ہوتے دیکھا۔ کئی تو اپنے نواح میں لوگوں کو پے درپے مرتے دیکھ کر مرنے سے پہلے ہی مر گئے۔ بعض اوقات تو ایسا ہؤا کہ کوئی معمولی طور پر بیمار آدمی وہاں کی وبائی فضا ہی کے جراثیم سے ہلاک ہو گیا۔ اور پھر کثرتِ اموات کی وجہ سے آخری رسوم بھی کوارنٹین کے مخصوص طریقہ پر ادا ہوتیں یعنی سینکڑوں لاشوں کو مردہ کتوں کی نعشوں کی طرح گھسیٹ کر ایک بڑے ڈھیر کی صورت میں جمع کیا جاتا۔ اور بغیر کسی کے مذہبی رسوم کا احترام کئے پٹرول ڈال کر سب کو نذرِ آتش کر دیا جاتا۔ اور شام کے وقت جب ڈوبتے ہوئے سورج کی آتشیں شفق کے ساتھ بڑے بڑے شعلے یک رنگ وہم آہنگ ہوتے تو دوسرے مریض یہی سمجھتے کہ تمام دنیا کو آگ لگ رہی ہے۔

کوارنٹین اس لئے بھی زیادہ اموات کا باعث ہوئی کہ بیماری کے آثار نمودار ہوتے تو بیمار کے متعلقین اُسے چھپانے لگتے۔ تاکہ کہیں مریض کو جبراً کوارنٹین میں نہ لے جائیں۔ چونکہ ہر ایک ڈاکٹر کو تنبیہ کی گئی تھی کہ

مریض کی خبر پلتے ہی فوراً مطلع کرے۔ اس لیئے لوگ ڈاکٹروں سے علاج بھی نہ کرانے۔ اور کسی گھر کے وبائی ہونے کا صرف اُسی وقت پتہ چلتا۔ جب کہ جگر دوز آہ و بکا کے درمیان ایک لاش اُس گھر سے نکلتی۔

اُن دِنوں میں کوارنٹین میں بطور ایک ڈاکٹر کے کام کر رہا تھا۔ پلیگ کا خوف میرے دل و دماغ پر بھی مسلط تھا۔ شام کو گھر آنے پر میں ایک عرصہ تک کار بالک صابن سے ہاتھ دھوتا رہتا اور جراثیم کش مرکب سے غرارے کرتا۔ یا پیٹ کو جلا دینے والی گرم کافی یا برانڈی پی لیتا۔ اگرچہ اُس سے مجھے بے خوابی اور آنکھوں کے چندھے پن کی شکایت پیدا ہو گئی۔ کئی دفعہ بیماری کے خوف سے میں نے قے آور دوائیں کھا کر اپنی طبیعت کو صاف کیا۔ جب نہایت گرم کافی یا برانڈی پینے سے پیٹ میں تخمیر ہوتی۔ اور بخارات اُٹھ اُٹھ کر دماغ کی طرف جاتے، تو میں اکثر ایک حواس باختہ شخص کے مانند طرح طرح کی قیاس آرائیاں کرتا۔ گلے میں ذرا بھی خراش محسوس ہوتی تو میں سمجھتا کہ پلیگ کے نشانات نمودار ہونے والے ہیں۔

—— اُف! میں بھی اس موذی بیماری کا شکار رہوں گا ... پلیگ! اور پھر —— کوارنٹین!

اُنہیں دنوں میں نو عیسائی ولیم بھاگو خاکروب جو میری گلی میں صفائی کیا کرتا تھا میرے پاس آیا اور بولا " بابوجی —— غضب ہو گیا

آج امبوُ اسی محلہ کے قریب سے بیس اور ایک بیمار لے گئی ہے۔"
"اکیس؟ ایمبولینس میں ۔ ۔ ۔ ۔؟"میں نے متعجب ہوتے ہوئے یہ الفاظ کہے۔

"جی ہاں ۔ ۔ ۔ پورے بیس اور ایک ——— اُنہیں بھی کونٹن (کوارنٹین) لے جائیں گے ——— آہ! وہ بیچارے کبھی واپس نہ آئیں گے کیا؟"

دریافت کرنے پر مجھے علم ہوُا کہ بھاگو رات کے تین بجے اُٹھتا ہے آدھ پاؤ شراب چڑھا لیتا ہے۔ اور پھر حسب ہدایت کمیٹی کی گلیوں میں اور نالیوں پر چونا بکھیرنا شروع کر دیتا ہے تاکہ جراثیم پھیلنے نہ پائیں۔ بھاگو نے مجھے مطلع کیا کہ اُس کے تین بجے اُٹھنے کا یہ بھی مطلب ہے کہ بازار میں پڑی ہوئی لاشوں کو اکٹھا کرے اور اُس محلہ میں جہاں وہ کام کرتا ہے اُن لوگوں کے چھوٹے موٹے کام کاج کرے۔ جو بیماری کے خوف سے باہر نہیں نکلتے۔ بھاگو تو بیماری سے ذرا بھی نہیں ڈرتا تھا۔ اُسکا خیال تھا جو مرنا ہو گا خواہ وہ کہیں چلا جائے۔ بچ نہیں سکتا۔

اُن دنوں جب کوئی کسی کے پاس نہیں پھٹکتا تھا۔ بھاگو سر اور مُنہ پر منڈاسا باندھے نہایت مستعد ہو کر بنی نوع انسان کی خدمتگذاری کر رہا تھا۔ اگرچہ اُس کا علم نہایت محدود تھا۔ تاہم اپنے تجربہ کی بنا پر

وہ ایک مقرر کی طرح لوگوں کو بیماری سے بچنے کی تراکیب بتاتا۔ عام صفائی، چوتا بکھیرنے اور گھر سے باہر نہ نکلنے کی تلقین کرتا۔ ایک دن میں نے اُسے لوگوں کو شراب کثرت سے پینے کی تلقین کرتے ہوئے بھی دیکھا۔ اُس دن جب وہ میرے پاس آیا۔ تو میں نے پوچھا " بھاگو تمہیں پلیگ سے ڈر بھی نہیں لگتا؟"

" نہیں بابوجی ——— بن آئی بال بھی بینکا نہیں ہوگا۔ آپ اِتے بڑے حکیم ٹھہرے۔ ہزاروں نے آپ کے ہاتھ سے شفا پائی۔ مگر جب میری آئی ہو گی تو آپ کا دارو درمن بھی کچھ اثر نہ کرے گا . . . . ہاں بابوجی ——— آپ بُرا نہ مانیں میں ٹھیک اور صاف صاف کہہ رہا ہوں" اور پھر گفتگو کا رُخ بدلتے ہوئے بولا" کچھ کونٹن کی کہئے بابوجی ——— کونٹن کی"

" وہاں کوارنٹین میں ہزاروں مریض آگئے ہیں۔ ہم حتی الوسع اُنکا علاج کرتے ہیں۔ مگر کہاں تک، نیز میرے ساتھ کام کرنے والے خود بھی زیادہ دیر اُن کے درمیان رہنے سے گھبراتے ہیں۔ خوف سے اُنکے گلے اور لب سوکھے رہتے ہیں۔ پھر تمہاری طرح کوئی مریض کے منہ کے ساتھ منہ نہیں جا لگاتا۔ نہ کوئی تمہاری طرح اتنی جان مارتا ہے . . . . . بھاگو! خدا تمہارا بھلا کرے۔ جو تم بنی نوع انسان کی اس قدر خدمت کرتے ہو ——— !"

بھاگو نے گردن جھکا دی اور منڈاسے کے ایک پلّو کو منہ پر سے

ہٹاکر، شراب کے اثر سے سرخ ہو چکے ہوئے چہرے کو دکھاتے ہوئے بولا "بابو جی، میں کس لائق ہوں۔ مجھ سے کسی کا بھلا ہو جائے، میرا یہ نکمّا تن کسی کے کام آجائے۔ اس سے زیادہ خوش قسمتی اور کیا ہو سکتی ہے بابو جی بڑے پادری لابے (ریورینڈ مونٹ ل آبے) جو ہمارے محلوں میں اکثر پرچار کے لئے آیا کرتے ہیں۔ کہتے ہیں۔ خداوند یسوع مسیح یہی سکھاتا ہے کہ بیمار کی مدد میں اپنی جان تک لڑا دو۔۔۔ میں سمجھتا ہوں۔۔۔"

میں نے بھاگو کی ہمت کو سراہنا چاہا۔ مگر کثرت جذبات سے میں رُک گیا۔ اُس کی خوش اعتقادی اور عملی زندگی کو دیکھ کر میرے دل میں ایک جذبۂ رشک پیدا ہوا۔ میں نے دل میں فیصلہ کیا کہ آج کوارنٹین میں پوری تن دہی سے کام کر کے بہت سے مریضوں کو بقید حیات رکھنے کی کوشش کروں گا۔ اُن کو آرام پہنچانے میں اپنی جان تک لڑا دوں گا۔ مگر کہنے اور کرنے میں بہت فرق ہوتا ہے۔ کوارنٹین میں پہنچکر جب میں نے مریضوں کی خوفناک حالت دیکھی۔ اور اُن کے منہ سے پیدا شدہ تعفّن میرے نتھنوں میں پہنچا تو میری روح لرز گئی اور بھاگو کی تقلید کرنے کی ہمت نہ پڑی۔

تاہم اُس دن بھاگو کو ساتھ لیکر میں نے کوارنٹین میں بہت کام کیا۔ جو کام مریض کے زیادہ قریب رہ کر ہو سکتا تھا۔ وہ میں نے

بھاگو سے گرایا۔ اور اُس نے بلا تامل کیا . . . . خود مَیں مریضوں سے
دُور دُور ہی رہتا۔ اس لئے کہ میں موت سے بہت خائف تھا اور کوارنٹین
سے اُس سے زیادہ خائف!

مگر کیا بھاگو موت اور کوارنٹین دونوں سے بالاتر تھا؟

اُس دن کوارنٹین میں چار سَو کے قریب مریض داخل ہوئے اور
اڑھائی سَو کے لگ بھگ لقمۂ اجل ہو گئے!

(۲)

یہ بھاگو کی جانبازی کا صدقہ ہی تھا کہ میں نے بہت سے مریضوں
کو شفایاب کیا۔ وہ نقشہ جو مریضوں کی رفتارِ صحت کے متعلق چیف
میڈیکل آفیسر کے کمرے میں آویزاں تھا۔ اُس میں میرے تحت میں رکھے
ہوئے مریضوں کی اوسط صحت کی لکیر سب سے اونچی چڑھی ہوئی دکھائی
دیتی تھی۔ میں ہر روز کسی نہ کسی بہانہ سے اُس کمرہ میں چلا جاتا اور اُس لکیر
کو سو فیصدی کی طرف اوپر ہی اوپر بڑھتے دیکھ کر دل میں بہت خوش ہوتا۔
ایک دن میں نے برانڈی ضرورت سے زیادہ پی لی۔ میرا دل دھک
دھک کرنے لگا۔ نبض گھوڑے کی طرح دوڑنے لگی۔ اور میں ایک جنونی
کی مانند اِدھر اُدھر بھاگنے لگا۔ مجھے خود شک ہونے لگا کہ پلیگ کے

جراثیم نے مجھ پر آخر کار اپنا اثر کر ہی دیا ہے اور عنقریب ہی گلٹیاں میرے
گلے یا رانوں میں نمودار ہوں گی۔ میں بہت سراسیمہ ہو گیا۔ اُس دن میں
نے کوارنٹین سے بھاگ جانا چاہا۔ جتنا عرصہ بھی میں وہاں ٹھہرا۔ خوف
سے کانپتا رہا۔ اُس دن مجھے بھاگو کو دیکھنے کا صرف دو دفعہ اتفاق ہوا۔
دوپہر کے قریب میں نے اُسے ایک مریض سے لپٹے ہوئے دیکھا۔
وہ نہایت پیار سے اُس کے ہاتھوں کو تھپک رہا تھا۔ مریض میں جتنی
بھی سکت تھی اُسے مجتمع کرتے ہوئے اُس نے کہا "بھئی اللہ ہی مالک
ہے۔ اس جگہ تو خدا دشمن کو بھی نہ لائے۔ میری دو لڑکیاں . . . ."
بھاگو نے اُس کی بات کو کاٹتے ہوئے کہا "خداوند یسوع مسیح
کا شکر کرو بھائی ـــــــ تم تو اچھے دکھائی دیتے ہو"
"ہاں بھائی شکر ہے خدا کا ـــــــ پہلے سے کچھ اچھا ہی ہوں۔
اگر میں کوارنٹین . . . ."
ابھی یہ الفاظ اُس کے منہ میں ہی تھے کہ اُس کی نسیں کھچ گئیں۔
اُس کے منہ سے کف جاری ہو گیا۔ آنکھیں پتھرا گئیں۔ کئی جھٹکے آئے اور
اور وہ مریض جو ایک لمحہ پہلے سب کو اور خصوصاً اپنے آپ کو اچھا
دکھائی دے رہا تھا، ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گیا۔ بھاگو اُس کی موت
پر دکھائی نہ دینے والے، خون کے آنسو بہانے لگا۔ اور کون اُس کی

موت پر آنسو بہاتا۔ کوئی اُس کا وہاں ہوتا تو اپنے جگر دوز نالوں سے ارض وسما کو شق کر دیتا۔ ایک بھاگو ہی تھا۔ جو سب کا رشتہ دار تھا۔ سب کے لئے اُس کے دل میں درد تھا۔ وہ سب کی خاطر روتا اور کڑھتا تھا ــــــ ایک دن اُس نے خداوند یسوع مسیح کے حضور میں نہایت عجز وانکسار سے اپنے آپ کو بنی نوع انسان کے گناہ کے کفارہ کے طور پر بھی پیش کیا۔

اُسی دن شام کے قریب بھاگو میرے پاس دوڑا دوڑا آیا۔ سانس پھولی ہوئی تھی۔ اور وہ ایک دردناک آواز سے کراہ رہا تھا۔ بولا "بابو جی ــــ یہ کونٹین تو دوزخ ہے دوزخ۔ پادری لابے اسی قسم کی دوزخ کا نقشہ کھینچا کرتا تھا . . . . "

میں نے کہا "ہاں بھائی، یہ دوزخ سے بھی بڑھ کر ہے ــــ میں تو یہاں سے بھاگ نکلنے کی ترکیب سوچ رہا ہوں . . . . میری طبیعت آج بہت خراب ہے۔"

"بابو جی اس سے زیادہ اور کیا بات ہو سکتی ہے . . . . آج ایک مریض جو بیماری کے خوف سے بے ہوش ہو گیا تھا۔ اُسے مردہ سمجھ کر کسی نے لاشوں کے ڈھیر میں جا ڈالا جب پٹرول چھڑکا گیا۔ اور آگ نے سب کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ تو میں نے اُسے شعلوں کے درمیان ہاتھ پاؤں

مارتے دیکھا۔ میں نے کود کر اُسے اٹھا لیا۔ بابوجی! وہ بہت بُری طرح جھلسا گیا تھا ـــــ اُسے بچاتے ہوئے میرا دایاں بازو بالکل جل گیا ہے۔"

میں نے بھاگو کا بازو دیکھا۔ اُس پر زرد زرد چربی نظر آرہی تھی۔ میں اُسے دیکھتے ہوئے لرز اُٹھا۔ میں نے پوچھا" کیا وہ آدمی بچ گیا ہے پھر ـــــ؟

" بابوجی ـــــ وہ کوئی بہت شریف آدمی تھا۔ جس کی نیکی اور شریفی (شرافت) سے دُنیا کوئی فائدہ نہ اُٹھا سکی، اُس نے درد وکرب کی حالت میں اُس نے اپنا جُھلسا ہوا چہرہ اوپر اٹھایا اور اپنی مریل سی نگاہ میری نگاہ میں ڈالتے ہوئے اُس نے میرا شکریہ ادا کیا۔"

"ـــــ اور بابوجی" بھاگو نے اپنی بات کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "اس کے کچھ عرصہ بعد وہ اتنا تڑپا، اتنا تڑپا کہ آج تک میں نے کسی مریض کو اس طرح جان توڑتے نہیں دیکھا ہوگا ـــــ اس کے بعد وہ مر گیا کتنا اچھا ہوتا۔ جو میں اُسے اُسی وقت جل جانے دیتا۔ اُسے بچا کر میں نے اُسے مزید دُکھ سہنے کے لئے زندہ رکھا۔ اور پھر وہ بچا بھی نہیں، اب انہی جلے ہوئے بازوؤں سے میں پھر اُسے اُسی ڈھیر میں پھینک آیا ہوں ـــــ"

اس کے بعد بھاگو کچھ بول نہ سکا۔ درد کی ٹیسوں کے درمیان اُس

نے رُکتے رُکتے کہا۔ "آپ جانتے ہیں . . . . وہ کس بیماری . . .
سے مرا۔ پلیگ سے نہیں ـــــ کونٹین سے ـــــ کونٹین سے!"

(۳)

اگرچہ ہمہ یاراں دوزخ کا خیال اُس لامتناہی سلسلۂ قہر و غضب
میں لوگوں کو کسی حد تک تسلّی کا سامان بہم پہنچاتا تھا۔ تاہم مقہور بنی آدم
کی فلک شگاف صدائیں تمام شب کانوں میں آتی رہتیں۔ ماؤں کی آہ و
بکا، بہنوں کے نالے، بیویوں کے نوحے، بچوں کی چیخ و پکار شہر کی اُس فضا
میں جس میں کہ نصف شب کے قریب اُلّو بھی بولنے سے ہچکچاتے تھے۔
ایک نہایت المناک منظر پیدا کرتی تھی۔ جب صحیح و سلامت لوگوں کے
سینوں پر منوں بوجھ رہتا تھا تو اُن لوگوں کی حالت کیا ہوگی جو گھروں
میں بیمار پڑے تھے۔ اور جنہیں کسی یرقان زدہ کے مانند در و دیوار سے
مایوسی کی زردی ٹپکتی دکھائی دیتی تھی۔ اور پھر کوارنٹین کے مریض جنہیں
مایوسی کی حد سے گزر کر ملک الموت مجسم دکھائی دے رہا تھا، وہ زندگی
سے یوں چمٹے ہوئے تھے۔ جیسے کسی طوفان میں کوئی کسی درخت کی
چوٹی سے چمٹا ہوا ہو، اور پانی کی تیز و تند لہریں ہر لحظہ بڑھ کر اُس
چوٹی کو بھی ڈبو دینے کی آرزومند ہوں۔

میں اُس روز توہّم کی وجہ سے کوارنٹین بھی نہ گیا۔ کسی ضروری کام کا بہانہ کر دیا۔ اگرچہ مجھے سخت ذہنی کوفت ہوتی رہی ۔۔ کیونکہ یہ بہت ممکن تھا کہ میری مدد سے کسی مریض کو فائدہ پہنچ جاتا۔ مگر اُس خوف نے جو میرے دل و دماغ پر مسلّط تھا۔ مجھے پا بہ زنجیر رکھا۔ شام کو سوتے وقت مجھے اطلاع ملی کہ آج شام کوارنٹین میں پانسو کے قریب مزید مریض پہنچے ہیں۔

میں ابھی ابھی معدے کو جلا دینے والی گرم کافی پی کر سونے ہی والا تھا۔ کہ دروازے پر بھاگو کی آواز آئی۔ نوکر نے دروازہ کھولا تو بھاگو ہانپتا ہوا اندر آیا۔ بولا۔ "بابو جی ——— میری بیوی بیمار ہو گئی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس کے گلے میں گلٹیاں نکل آئی ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ خدا کے واسطے اُسے بچاؤ ۔ ۔ ۔ ۔ اس کی چھاتی پر ڈیڑھ سالہ بچہ دودھ پیتا ہے، وہ بھی ہلاک ہو جائے گا۔"

بجائے گہری ہمدردی کا اظہار کرنے کے میں نے خشمگیں لہجہ میں کہا۔

"اس سے پہلے کیوں نہ آسکے ——— کیا بیماری ابھی ابھی شروع ہوئی ہے؟"

"صبح معمولی بخار تھا ——— جب میں کوارنٹین گیا ۔ ۔ ۔ ۔"

"اچھا ——— وہ گھر میں بیمار تھی۔ اور پھر بھی تم کوارنٹین گئے؟"

"جی بابو جی ——— " بھاگو نے کانپتے ہوئے کہا۔ "وہ بالکل معمولی طور پر بیمار تھی۔ میں نے سمجھا کہ شاید دودھ چڑھ گیا ہے ——— اسکے سوا اور کوئی تکلیف نہیں ——— اور پھر میرے دونوں بھائی گھر پر ہی تھے ۔ ۔ ۔ ۔ اور

سینکڑوں مریض کونٹین میں بے بس . . . . "

" تو تم اپنی حد سے زیادہ مہربانی اور قربانی سے جراثیم کو گھر لے ہی آئے نا۔ میں نہ تم سے کہتا تھا کہ مریضوں کے اتنا قریب مت رہا کرو ـــــ دیکھو میں آج اسی وجہ سے وہاں نہیں گیا ۔ اِس میں سب تمہارا قصور ہے ۔ اب میں کیا کر سکتا ہوں ۔ تم سے جانباز کو اپنی جانبازی کا مزا بھگتنا ہی چاہیئے ۔ جہاں شہر میں سینکڑوں مریض پڑے ہیں . . . . . "

بھاگو نے ملتجیانہ انداز سے کہا " مگر خداوند یسوع مسیح . . . "

" چلو ہٹو ـــــ بڑے آئے کہیں کے ـــــ تم نے جان بوجھ کر آگ میں ہاتھ ڈالا ۔ اب اِس کی سزا میں بھگتوں ؟ قربانی ایسے تھوڑی ہوتی ہے ۔ میں اتنی رات کے وقت تمہاری کچھ مدد نہیں کر سکتا ـــــ "

" مگر پادری لابے . . . . "

" چلو ـــــ جاؤ ـــــ پادری ل آبے کے کچھ ہوتے . . . "

بھاگو سر جھکائے وہاں سے چلا گیا ۔ اُس کے آدھ گھنٹہ بعد جب میرا غصّہ فرو ہوُا تو میں اپنی حرکت پر نادم ہونے لگا ۔ میں عاقل کہاں کا تھا جو بعد میں ہدفِ سہامِ پشیمانی ہو رہا تھا ۔ میرے لئے یہی یقیناً سب سے بڑی سزا تھی کہ اپنی تمام خودداری کو پامال کرتے ہوئے بھاگو کے سامنے گذشتہ رویہ پر اظہارِ معذرت کرتے ہوئے اُس کی بیوی کا پوری جانفشانی سے علاج کروں ۔

میں نے جلدی جلدی کپڑے پہنے اور دوڑا دوڑا بھاگو کے گھر پہنچا... وہاں پہنچنے پر میں نے دیکھا کہ بھاگو کے دونوں چھوٹے بھائی اپنی بھاوج کو چارپائی پر لٹائے ہوئے باہر نکال رہے تھے ـــــ

میں نے بھاگو کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا "اسے کہاں لے چلے ہو؟"

بھاگو نے آہستہ سے جواب دیا "کونٹین میں...."

"تو کیا اب تمہاری دانست میں کوارنٹین دوزخ نہیں رہا ـــــ بھاگو؟...."

"آپ نے جو آنے سے انکار کر دیا۔ بابو جی ـــــ اور چارہ ہی کیا تھا میرا خیال تھا۔ وہاں حکیم کی مدد مِل جائے گی اور دوسرے مریضوں کے ساتھ اِسکا بھی خیال رکھوں گا۔"

"یہاں رکھ دو چارپائی.. ابھی تک تمہارے دماغ سے دوسرے مریضوں کا خیال نہیں گیا ہے.. احمق..."

چارپائی اندر رکھ دی گئی اور میرے پاس جو تیر بہدف دوا تھی میں نے بھاگو کی بیوی کو پلائی۔ اور پھر اپنے غیر مرئی حریف کا مقابلہ کرنے لگا۔ بھاگو کی بیوی نے آنکھیں کھول دیں۔

بھاگو نے ایک لرزتی ہوئی آواز میں کہا "آپ کا احسان ساری عمر نہ بھولوں گا ـــــ بابو جی"۔

میں نے کہا" مجھے اپنے گذشتہ رویہ پر سخت افسوس ہے بھاگو ——
ایشور تمہیں تمہاری خدمات کا صلہ تمہاری بیوی کی شفا کی صورت میں دے۔"

اُسی وقت میں نے اپنے غیر مرئی حریف کو اپنا آخری حربہ استعمال کرتے دیکھا۔ بھاگو کی بیوی کے لب پھڑکنے لگے۔ نبض جو کہ میرے ہاتھ میں تھی مدہم ہو کر شانہ کی طرف سرکنے لگی۔ میرے غیر مرئی حریف نے جس کی عموماً فتح ہوتی تھی حسب معمول پھر مجھے چاروں شانے چت گرا دیا۔ میں نے ندامت سے سر جھکاتے ہوئے کہا"بھاگو! بدنصیب بھاگو! تمہیں اپنی قربانی کا یہ عجیب صلہ ملا ہے —— آہ!"

بھاگو پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

آہ! وہ نظارہ کتنا دلدوز تھا، جبکہ بھاگو نے اپنے بلبلاتے ہوئے بچے کو اس کی ماں سے ہمیشہ کے لئے علیحدہ کر دیا اور مجھے نہایت عجز و انکسار سے واپس لوٹا دیا۔

میرا خیال تھا کہ اب بھاگو اپنی دنیا کو تاریک پا کر کسی کا خیال نہ کریگا ..... مگر اُس سے اگلے روز میں نے اُسے بیش از پیش مریضوں کی امداد کرتے دیکھا۔ اُس نے سینکڑوں گھروں کو بے چراغ ہونے سے بچا لیا —— اور اپنی زندگی کو ہیچ سمجھا۔ میں نے بھی بھاگو کی تقلید میں نہایت مستعدی سے کام کیا۔ کوارنٹین اور ہسپتالوں سے فارغ ہو کر اپنے

فالتو وقت میں نے شہر کے غریب طبقہ کے لوگوں کے گھر جو کہ بدروؤں کے کنارے پر واقع ہونے کی وجہ سے یا غلاظت کے سبب بیماری کے مسکن تھے، رجوع کیا۔

(۴)

اب فضا بیماری کے جراثیم سے بالکل پاک ہو چکی تھی۔ شہر کو بالکل دھو ڈالا گیا تھا، چوہوں کا کہیں نام و نشان دکھائی نہ دیتا تھا۔ سارے شہر میں صرف ایک آدھ کیس ہوتا جس کی طرف فوری توجہ دیئے جانے پر بیماری کے بڑھنے کا احتمال باقی نہ رہا۔

کاروبارِ شہر نے اپنی طبعی حالت اختیار کر لی، سکول، کالج اور دفاتر کھلنے لگے۔

ایک بات جو میں نے شدت سے محسوس کی وہ یہ تھی کہ بازار میں گزرتے وقت چاروں طرف سے انگلیاں مجھی پر اُٹھتیں۔ لوگ احسانمندانہ نگاہوں سے میری طرف دیکھتے۔ اخباروں میں تعریفی کلمات کے ساتھ میری تصاویر چھپیں۔ اس چاروں طرف سے تحسین و آفرین کی بوچھاڑ نے میرے دل میں کچھ غرور سا پیدا کر دیا۔

آخر ایک بڑا عظیم الشان جلسہ ہوا جس میں شہر کے بڑے بڑے رئیس

اور ڈاکٹر مدعو کیئے گئے۔ وزیر بلدیات نے اُس جلسہ کی صدارت کی۔
میں صاحب صدر کے پہلو میں بٹھایا گیا۔ کیونکہ وہ دعوت در اصل میرے
ہی اعزاز میں دی گئی تھی۔ ہاروں کے بوجھ سے میری گردن جھکی جاتی تھی اور
میری شخصیت بہت نمایاں معلوم ہوتی تھی۔ پُر غرور نگاہ سے میں کبھی ادھر
دیکھتا کبھی اُدھر۔۔۔ بنی آدم کی انتہائی خدمت گذاری کے صلہ میں کمیٹی
شکر گذاری کے جذبہ میں معمور ایک ہزار روپے کی تھیلی بطور ایک حقیر رقم
کے مجھے نذر کر رہی تھی۔

جتنے بھی لوگ موجود تھے، سب نے میری خصوصاً اور میرے رفقاء کار
کی عموماً تعریف کی اور کہا کہ گذشتہ آفت میں جتنی جانیں میری جانفشانی
اور تن دہی سے بچی ہیں۔ ان کا شمار نہیں۔ میں نے نہ دن کو دن دیکھا نہ
رات کو رات، اپنی حیات کو حیاتِ قوم اور اپنے سرمایہ کو سرمایۂ ملت سمجھا۔
اور بیماری کے مسکنوں میں پہنچکر مرتے ہوئے مریضوں کو جامِ شفا پلایا!

وزیر بلدیات نے میز کے بائیں پہلو میں کھڑے ہو کر ایک پتلی سی
چھڑی ہاتھ میں لی اور حاضرین کو مخاطب کرتے ہوئے اُن کی توجہ اُس سیاہ
لکیر کی طرف دلائی جو دیوار پر آویزاں نقشے میں بیماری کے دنوں میں
صحت کے درجہ کی طرف ہر لحظہ افتاں وخیزاں بڑھی جا رہی تھی۔ آخر میں
۔۔۔۔ انہوں نے نقشہ میں وہ دن بھی دکھایا۔ جب میرے زیرِ نگرانی چوّن

مریض رکھے گئے اور وہ تمام صحت یاب ہو گئے۔ یعنی نتیجہ سو فیصدی کامیابی رہا اور وہ سیاہ لکیر اپنی معراج کو پہنچ گئی۔

اس کے بعد وزیر بلدیات نے اپنی تقریر میں میری ہمت کو بہت کچھ سراہا اور کہا کہ لوگ یہ جان کر بہت خوش ہونگے کہ بخشی جی اپنی خدمات کے صلہ میں لفٹیننٹ کرنل بنائے جا رہے ہیں۔

ہال تحسین و آفرین کی آوازوں اور پُرشور تالیوں سے گونج اُٹھا۔

انہی تالیوں کے شور کے درمیان میں نے اپنی پُرغرور گردن اُٹھائی صاحب صدر اور معزز حاضرین کا شکریہ ادا کرتے ہوئے ایک لمبی چوڑی تقریر کی۔ جس میں علاوہ اور باتوں کے میں نے بتایا کہ ڈاکٹروں کی توجہ کے قابل ہسپتال اور کوارنٹین ہی نہیں تھے۔ بلکہ اُن کی توجہ کے قابل غریب طبقہ کے لوگوں کے گھر تھے۔ وہ لوگ اپنی مدد کے بالکل ناقابل تھے، اور وہی زیادہ تر اس موذی بیماری کا شکار ہوتے۔ میں اور میرے رفقا نے بیماری کے صحیح مقام کو تلاش کیا۔ اور اپنی پوری توجہ بیماری کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے میں صرف کر دی۔ کوارنٹین اور ہسپتال سے فارغ ہو کر ہم نے راتیں اُنہی خوفناک مسکنوں میں گذاریں۔

اُسی دن جلسہ کے بعد جب میں بطور ایک لفٹیننٹ کرنل کے اپنی پُرغرور گردن کو اٹھائے ہوئے، ہاروں سے لدا پھندا، لوگوں کا 'ناچیز ہدیہ' ایکہزار

ایک روپے کی صورت میں جیب میں ڈالے ہوئے گھر پہنچا، تو مجھے ایک طرف سے دبی ہوئی آواز سنائی دی۔

"بابو جی . . . . . بہت بہت مبارک ہو"

—— اور بھاگو نے مبارک باد دیتے وقت وہی اپنا پرانا جھاڑو قریب ہی کے گندے حوض کے ایک ڈھکنے پر رکھ دیا۔ اور دونوں ہاتھوں سے منڈاسا کھول دیا۔ میں بھونچکا سا کھڑا رہ گیا۔

"تم ہو؟ . . . بھاگو بھائی!" میں نے بمشکل تمام کہا"۔ . . دنیا تمہیں نہیں جانتی بھاگو تو نہ جانے . . . . میں تو جانتا ہوں۔ تمہارا یسوع تو جانتا ہے . . . پادری ل' آبے کے بے مثال چیلے . . . تجھ پر خدا کی رحمت ہو . . .!

اُس وقت میرا گلا سوکھ گیا۔ بھاگو کی مرتی ہوئی بیوی اور بچے کی تصویر میری آنکھوں میں کھچ گئی۔ ہاروں کے گرانبار سے مجھے اپنی گردن ٹوٹتی ہوئی معلوم ہوئی اور بٹوے کے بوجھ سے میری جیب پھٹنے لگی۔ اور —— اتنے اعزاز حاصل کرنے کے باوجود میں بے توقیر ہو کر اس قدر شناس دنیا کا ماتم کرنے لگا!

ٹُلادان

تُلادان

دھوبی کے گھر کہیں گورا چٹا چھوکرا پیدا ہو جائے تو اس کا نام بابو رکھ دیتے ہیں۔ سادھو رام کے گھر، بابو نے جنم لیا اور یہ صرف بابو کی شکل و صورت پر ہی موقوف نہیں تھا۔ جب وہ بڑا ہوا تو اس کی تمام عادتیں بابوؤں جیسی تھیں ماں کو حقارت سے 'اے یو' اور باپ کو 'چل بے' کہنا اُس نے نہ جانے کہاں سے سیکھ لیا تھا۔ وہ اُس کی رعونت سے بھری ہوئی آواز، پھونک پھونک کر پاؤں رکھنا، جوتوں سمیت چوکے میں چلے جانا، دودھ کے ساتھ بالائی نہ کھانا سبھی صفات بابوؤں والی ہی تو تھیں۔ جب وہ تحکمانہ انداز سے بولتا اور چل بے کہتا۔ تو سادھو رام ... "خی خی .... بالکل بابو" کہہ کر اپنے زرد زرد دانت نکال دیتا اور پھر خاموش ہو جاتا۔

بابو جب سکھ نندن، امرت اور دوسرے امیرزادوں میں کھیلتا تو کسی کو معلوم نہ ہوتا۔ کہ یہ اُس مالا کا منکا نہیں ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ایشور نے سب جیو جنتو کو ننگا کر کے اس دنیا میں بھیجا ہے۔ کوئی بولی وولی نہیں دی۔ یہ ذات لکھپتی، مہابراہمن، بھنوٹ، ہریجن، لنگوا فرینکا سب کچھ بعد میں لوگوں نے خود ہی ایجاد کیا ہے۔

بڑھئی کے پرواہیں سکھ نندن کے ماں باپ کھاتے پیتے آدمی تھے اور ساوھورام اور دوسرے آدمی انہیں کھاتے پیتے دیکھنے والے.. سکھ نندن کا جنم دن آیا۔ تو پڑوا کے بڑے بڑے نیتا گگن دیو بھنڈاری، ڈال چند، گنپت مہابراہمن وغیرہ کھانے پر مدعو کئے گئے۔ ڈال چند اور گنپت مہابراہمن دونوں موٹے آدمی تھے۔ اور قریب قریب ہر ایک دعوت میں دیکھے جاتے تھے۔ اُن کی اُبھری ہوئی توند کے نیچے پتلی سی دھوتی میں لنگوٹ، بھاری بھر کم جسم پر ہلکا سا جنیئو، لمبی چوٹی، چندن کا ٹیکا دیکھ کر بابو جلتا تھا۔ اور بھلا یہ بھی کوئی جلنے کی بات تھی۔ شاید ایک ننھا سا نازک بدن بابو بننے کے بعد انسان ایک بدزیب بے ڈول سا پنڈت بننا چاہتا ہے ——————

——————— اور پنڈت بننے کے بعد ایک پست ضمیر گنا ہگار انسان اور اچھوت ... ڈال چند اور گنپت مہابراہمن کے چلن کے متعلق بہت سی باتیں مشہور تھیں۔ یہ انسانی فطرت کی نیرنگی ہر جگہ کرشمے دکھاتی ہے۔

بابو نے دیکھا۔ جہاں بھنڈاری اور مہابراہمن، بھبوت آئے ہوئے تھے، وہاں عمداں مراسن، ہرکھو، جرٹی داداکا رندے اور دو تین جھوٹی پتلیں اور دونے اٹھانے والے جھیور بھی دکھائی دے رہے تھے۔ جب دس پندرہ آدمی کھانے سے فارغ ہو جاتے تو جھیور پتلوں اور دونوں سے بچی کھچی چیزیں ایک جگہ اکٹھی کرتے جمعدارنی صحن میں ایک جگہ چادر

کا پلہ بچھاتے بیٹھی تھی۔ وہ سب بچی کھچی چیزیں، حلوہ، دال، توڑے ہوئے لقمے، پکوڑیاں ملے ہوئے آلو مٹر اور چاول اُس بچی ہوئی چادر یا ایلومینیم کے ایک بڑے سے زنگ آلودہ تسلے میں ڈالدیتے۔ اُس کے سامنے سب چیزیں کھچڑی دیکھ کر بابو رہ نہ سکا۔ بولا۔

"جمعدارنی —— کیسے کھاؤگی یہ سب چیزیں؟"

جمعدارنی ہنس پڑی، ناک سکیڑتی ہوئی بولی "جیسے تم روٹی کھاتے ہو۔"

اس عجیب اور سادہ سے جواب سے بابو کی رعونت کو ٹھیس لگی۔ بولا "کتنی ناسمجھ ہو تم . . . اتنی سی بات نہ سمجھیں۔ تبھی تو تم لوگ جوتوں میں بیٹھنے کے لائق ہو۔"

حلال خوری کی اکڑ زبانزد عام ہے۔ ماتھے پر تیور ڈالتی ہوئی جمعدارنی بولی۔

"اور تم تو عرش پر بیٹھنے کے لائق ہو . . . ہے نا؟"

"یونہی خفا ہو گئیں تم تو" بابو بولا "میرا مطلب تھا۔ سالن میں حلوہ، پکوڑیوں میں آلو مٹر، پلاؤ میں فرنی، یہ تمام چیزیں کھچڑی نہیں بن گئیں کیا؟"

جمعدارنی نے کوئی جواب نہ دیا۔

بھنڈاری اور مہا براہمن کو اچھی جگہ پر بٹھایا گیا۔ وہ سادھوؤں کی سی رودرکش کی مالا گلے میں ڈالے کنکھیوں سے بار بار رمعداں اور جمعدارنی

کی طرف دیکھتے رہے۔ عمداں جمعدارنی کے قریب ہی بیٹھی تھی۔ ہر کھوجڑنی
دادا دھوپ میں بیٹھے ہوئے کھاتے پیتے آدمیوں کا منہ دیکھ رہے تھے کب
وہ سب کھا چکیں تو اُنہیں بھی کچھ میسر ہو۔ بابو نے دیکھا عمداں کے قریب
ہی ایندھن کی اوٹ میں اُس کی اپنی ماں بیٹھی تھی۔ اس کے قریب برتن
مانجھنے کے لئے راکھ اور نیم سوختہ اوپلے پڑے تھے۔ اور راکھ سے اس کا
لہنگا خراب ہو رہا تھا۔ قمیص بھی خراب ہو رہی تھی۔ خیر! قمیص کی تو کوئی بات
نہ تھی۔ وہ تو کسی کی تھی۔ اور دھلنے کے لئے آئی تھی۔ ایک دفعہ دھوکر بابو
کی ماں نے پہن لی تو کچھ نہیں بگڑ گیا۔ پرماتما بھلا کرے بادلوں کا کہ
انہی کی مہربانی سے ایسا موقع میسّر ہوا۔

جب اپنے دوست سکھی نندن کو ملنے کے لئے بابو نے آگے بڑھنا چاہا
تو ایک شخص نے اُسے چپت دکھا کر وہیں روک دیا۔ اور کہا: "خبردار! دھوبی
کے بچے . . . دیکھتا نہیں کدھر جا رہا ہے"۔ بابو تھم گیا۔ سوچنے لگا۔ کہ
اُس کے ساتھ لڑے یا نہ لڑے۔ جھیور کا تنومند جسم دیکھ کر دب گیا۔ اور یوں
بھی وہ ابھی بچہ تھا۔ بھلا اتنے بڑے آدمی کا کیا مقابلہ کرے گا۔ اُس نے
ایک اداس اینٹھی ہوئی نظر سے اچھی جگہ پر بیٹھ کر کھانے والوں اور نیم سوختہ
اوپلوں کی راکھ اور جوتوں میں پڑے ہوئے انسانوں کو دیکھا۔ اور دل میں
کہا۔ اگرچہ سب ننگے پیدا ہوتے ہیں۔ مگر ایک کارندے اور براہمن میں کتنا

فرق ہے ۔

پھر دل میں کہنے لگا۔ سکھ نندن اور بابو میں کتنا فرق ہے۔ اور ہلکی سی ایک ٹیس اُس کے کلیجہ میں اُٹھی۔ حقیقت تو بابو کے سامنے تھی۔ مگر اتنی مکروہ شکل میں کہ وہ خود اُسے دیکھنے سے گھبراتا تھا۔ بابو دل ہی دل میں کہنے لگا۔ ہم لوگوں کے وجود ہی سے تو یہ لوگ جیتے ہیں۔ دن کی طرح اُجلے اُجلے کپڑے پہنتے ہیں ۔ ۔ ۔ " دراصل بابو کو بھوک لگ رہی تھی۔ وہی پکوڑیوں، حلوہ مانڈے کے خیال میں اس مکروہ حقیقت تو کیا وہ اپنے وجود سے بھی بے نیاز ہوگیا۔ گرم گرم پوریوں کی صبر آزما خوشبو اُس کے دماغ میں بسی جا رہی تھی۔ اچانک اُس کی نظر عمداں پر پڑی۔ عمداں کی نظر بھی ٹوکری میں گھی میں بسی ہوئی پوریوں کے ساتھ ساتھ جاتی تھی۔ جب سکھ نندن کی ماں قریب سے گذری تو اُس کو متوجہ کرنے کے لئے عمداں بولی۔

"جھمانی ۔ ۔ ۔ ذرا حلوائی کو ڈانٹو تو ۔ ۔ ۔ اے دیکھتیں نہیں کتنا گھی بہ رہا ہے جمیں (زمیں) پر"۔

جھمانی کڑک کر بولی ۔

" ارے او کشنو ۔ ۔ ۔ حلوائی کو کہنا ۔ ذرا پوریاں کڑاہی میں دبائے رکھے ۔"

بابو ہنسنے لگا۔ عمداں کچھ شرمندہ سی ہوگئی ۔ بابو جانتا تھا کہ عمداں

وہ سب باتیں محض اس وجہ سے کہ رہی ہے کہ اُس کا اپنا جی پوریاں کھانے کو بہت چاہتا ہے۔ گو جمیانی کی توجہ کو کھینچنے والے فقرے سے اُس کی خواہش کا پتہ نہیں چلتا۔ وہ متعجب تھا۔ اور سوچ رہا تھا کہ جس طرح اُس نے عمداں کے اُن غیر متعلق لفظوں میں چھپے ہوئے اصلی مطلب کو پا لیا ہے۔ کیا ایسا بھی ممکن ہے کہ اُس کی خاموشی میں کوئی اُس کی بات کو پا لے۔ آخر خاموشی گفتگو سے زیادہ معنی خیز ہوتی ہے۔

اُس وقت سکھ نندن تُل رہا تھا۔ خوبصورت ترازو کے ایک پلڑے میں بیٹھا چاروں طرف دیکھ کر مسکراتا جا رہا تھا۔ دوسری طرف گندم کا انبار لگا تھا۔ گندم کے علاوہ چاول باس متی، چنے، اُڑد، موٹے ماش اور دوسری اس قسم کی اجناس بھی موجود تھیں۔ سکھ نندن کو تول تول کر لوگوں میں اجناس بانٹی جا رہی تھیں۔ بابو کی ماں نے بھی پلہ بچھایا۔ اُسے بھی گندم کی دھڑی مل گئی۔ وہ سکھ نندن کی درازیٔ عمر کی دعائیں مانگتی ہوئی اُٹھ بیٹھی۔ بابو نے نفرت سے اپنی ماں کی طرف دیکھا گویا کہہ رہا ہو۔ چھی! انہیں کپڑوں کی دُھلائی پر قناعت ہی نہیں۔ تبھی تو ہر ایک کی میل نکالنے کا کام ایشور نے تمہارے سپرد کر دیا ہے۔ اور تم بھی جمعدارنی کی طرح جوتوں میں بیٹھنے کے لائق ہو۔ تمہاری کوکھ سے پیدا ہو جانے والے بابو کو چلاتی دھوپ میں کھڑا رہنا پڑتا ہے۔ آگے بڑھنے پر لوگ اُسے جھڑکتے ہیں۔ ہائے! تیری یہ بھٹی

ہوئی بے قناعت آنکھیں گن رم سے نہیں قبر کی مٹی سے پُر ہوں گی۔ قریب سے ماں گذری تو بابو بولا۔" اے تُو!"

پھر بابو سوچنے لگا۔ رام جانے میرا جنم دن کیوں نہیں آتا میری ماں مجھے کبھی نہیں تولتی۔ جب سکھ نندن کو اُس کے جنم دن کے موقع پر تول کر اجناس کا دان کیا جاتا ہی تو اُس کی سبھی مصیبتیں ٹل جاتی ہیں۔ اُسے سردی میں برف سے زیادہ ٹھنڈے پانی اور گرمیوں میں بھیجا چلا دینے والی دھوپ میں کھڑا نہیں ہونا پڑتا۔ بالوں میں لگانے کے لئے خاص لکھنؤ سے منگوایا ہوا آملے کا تیل ملتا ہے جیب پیسوں سے بھری رہتی ہے۔ بخلاف اُس کے میں تمام دن صابن کی جھاگ بناتا رہتا ہوں۔ سکھ نندن اس لئے صابن کے بلبلوں کو پسند کرتا ہے۔ کہ وہ بلبلے اور اُن میں چمکنے والے سات رنگ اُسے ہر روز نہیں دیکھنے پڑتے۔ یُوں کپڑے نہیں دھونے ہوتے... سکھی کی دنیا کو کتنی ضرورت ہے۔ خاص کر اُس کے ماں باپ کو۔ میرے ماں باپ کو میری ذرا بھی ضرورت نہیں۔ ورنہ وہ مجھے بھی جنم دن کے موقع پر یونہی تولتے۔ اور جب سے ننھی پیدا ہوگئی ہے —— چڑیل، ڈائن۔ اُسی دن سے میری چائے کی ایک پیالی بھی بند ہوگئی ہے . . . کہتے ہیں بلا ضرورت دنیا میں بھی کوئی پیدا نہیں ہوا۔ یہ باتھو جو نالی کے کنارے اُگ رہا ہے۔ بظاہر ایک فضول سا پودا ہے۔ جب اُس کی بھجیا بنتی ہے۔ تو مزا ہی تو

آجاتا ہے . . . . . اور پوریاں !

بابو کی ماں نے آواز دی ۔

" بابو . . . . . ارے او بابو "

اس وقت سکھ نندن بابو کو دیکھ کر مسکرا رہا تھا ۔ اب بابو کو امید بندھی ۔ کہ وہ خوب ضیافت اڑا سکے گا ۔ بابو اُس چبھنے والی دھوپ کو بھی بھول گیا ۔ جو برسات کے بعد تھوڑے سے عرصہ کے لئے نکلتی ہے ۔ اور اُس تھوڑے سے عرصہ میں ہی اپنی تب وتاب ختم کر دینا چاہتی ہے ۔ اُس نے ماں کی آواز پر کان نہ دھرا ۔ اور کان دھرتا بھی کیوں ؟ ماں کو اس کی کیا ضرورت تھی ضرورت ہوتی تو وہ اس کا جنم دن نہ مناتی ۔ وہ تو شاید اس دن کو کوستی ہوگی جبدن وہ پیدا ہوگیا . . . ۔ اگرچہ باتھو کی بھجیا بڑی خوش ذائقہ دار ہوتی ہے ۔

" بابو . . . . . ارے او بابو کے بچے ۔ آتا کیوں نہیں ؟" بابو کی ماں کی آواز آئی ۔

"بابو جاؤ . . . . . ابھی میں نہیں آسکتا " سکھ نندن نے کہا ۔ اور پھر ایک مغرورانہ انداز سے اپنے زرد وختہ کوٹ اور بابو کی طرف دیکھتا ہوا بولا ۔

"کل آنا بھائی . . . . . دیکھتے نہیں ہو آج مجھے فرصت ہے ؟ جاؤ "

عمداں کو پوریاں مل گئی تھیں ۔ وہ جمبانی کو فرشی سلام کر رہی تھی ۔ بابو نے سوچا تھا ۔ کہ شاید مسکراتا ہوا سکھی نندن اُس کی خاموشی میں اسکے

من کی بات کو پالیگا۔ مگر سکھ نندن کو آج بابو کا خیال کہاں آتا تھا۔ آج ہر چھوٹے بڑے کو سکھی کی ضرورت تھی۔ پر سکھی کو کسی کی ضرورت نہ تھی۔ اپنی عظمت اور بابو کے سادہ اور بوسیدہ، ٹاٹ کے سے کپڑوں کو دیکھ کر وہ شاید اُس سے نفرت کرنے لگا تھا۔ اپنی عدیم الفرصتی کا اظہار کرتے ہوئے اُس نے گویا بابو کی رہی سہی رعونت کو مٹی میں ملا دیا۔ پھر بابو کی ماں کی کرخت آواز آئی۔

"بابو ... تیرا ستیاناس، طون (طاعون) مارے ... گھُس جائے تیرے پیٹ میں ماتا کالی ... آتا کیوں نہیں۔ دو سو کپڑے پڑے ہیں۔ ... لیمر گیرنے والے ہیں تو رو رہی ہوں تیری جان کو ..."

بابو کو یہ محسوس ہوا۔ کہ نہ صرف سکھ نندن نے اُس کے جذبات کو ٹھیس لگائی ہے۔ اور وہ اُس کے ساتھ کبھی نہیں کھیلے گا۔ بلکہ اُس کی اپنی ماں جس کے پیٹ سے وہ ناحق پیدا ہوا تھا۔ وہی عورت جس سے اُسے دُنیا میں سب سے زیادہ پیار کی توقع ہے۔ وہ اُس سے ایسا سلوک کرتی ہے۔ کاش! میں اس دنیا میں پیدا ہی نہ ہوتا۔ اور اگر ہوتا تو یوں بابو نہ ہوتا۔ میری مٹی یوں خراب نہ ہوتی۔ آخر میں سکھی سے شکل و عقل میں بڑھ چڑھ کر نہیں؟

سکھ نندن کے جنم دن کو ایک مہینہ ہو گیا۔ تُلا دان کی آئی ہوئی گندم پیسی۔ پیس کر اس کی روٹی بنی۔ بابو کے ماں باپ نے کھائی۔ مگر بابو نے

آجاتا ہے . . . . . اور پوریاں !

بابو کی ماں نے آواز دی ۔

" بابو . . . . ارے او بابو "

اس وقت سکھ نندن بابو کو دیکھ کر مسکرا رہا تھا ۔ اب بابو کو امید بندھی ۔ کہ وہ خوب ضیافت اڑا سکے گا ۔ بابو اُس چبھنے والی دھوپ کو بھی بھول گیا ۔ جو برسات کے بعد تھوڑے سے عرصہ کے لئے نکلتی ہے ۔ اور اُس تھوڑے سے عرصہ میں ہی اپنی تب وتاب ختم کر دینا چاہتی ہے ۔ اُس نے ماں کی آواز پر کان نہ دھرا ۔ اور کان دھرتا بھی کیوں ؟ ماں کو اس کی کیا ضرورت تھی ضرورت ہوتی تو وہ اس کا جنم دن نہ مناتی ۔ وہ تو شاید اس دن کو کوستی ہوگی جبدن وہ پیدا ہو گیا . . . . اگرچہ باتھو کی بھجیا بڑی ذائقہ دار ہوتی ہے ۔

" بابو . . . . . ارے او بابو کے بچے ۔ آتا کیوں نہیں ؟" بابو کی ماں کی آواز آئی ۔

" بابو جاؤ . . . . . ابھی میں نہیں آسکتا ۔" سکھ نندن نے کہا ۔ اور پھر ایک مغرورانہ انداز سے اپنے زرد وخستہ کوٹ اور بابو کی طرف دیکھتا ہوا بولا ۔

" کل آنا بھائی . . . . دیکھتے نہیں ہو ، آج مجھے فرصت ہے ؟ جاؤ ۔"

عمداں کو پوریاں مل گئی تھیں ۔ وہ جمبانی کو فرشی سلام کر رہی تھی ۔ بابو نے سوچا تھا کہ شاید مسکراتا ہوا سکھ نندن اُس کی خاموشی میں اسکے

من کی بات کو پالیگا۔ مگر سکھ نندن کو آج بابو کا خیال کہاں آتا تھا۔ آج ہر چھوٹے بڑے کو سکھی کی ضرورت تھی۔ پر سکھی کو کسی کی ضرورت نہ تھی۔ اپنی عظمت اور بابو کے سادہ اور بوسیدہ، ٹاٹ کے سے کپڑوں کو دیکھ کر وہ شاید اُس سے نفرت کرنے لگا تھا۔ اپنی عدیم الفرصتی کا اظہار کرتے ہوئے اُس نے گویا بابو کی رہی سہی رعونت کو مٹی میں ملا دیا۔ پھر بابو کی ماں کی کرخت آواز آئی۔

"بابو... تیرا ستیاناس، طون (طاعون) مارے... گھُس جائے تیرے پیٹ میں ماتا کالی... آتا کیوں نہیں۔ دو سو کپڑے پڑے ہیں۔ ... لیمر گیرنے والے ہیں تو روہی ہوں تیری جان کو...."

بابو کو یہ محسوس ہوا۔ کہ نہ صرف سکھ نندن نے اُس کے جذبات کو ٹھیس لگائی ہے۔ اور وہ اُس کے ساتھ کبھی نہیں کھیلے گا۔ بلکہ اُس کی اپنی ماں جس کے پیٹ سے وہ ناحق پیدا ہوا تھا۔ وہی عورت جس سے اُسے دُنیا میں سب سے زیادہ پیار کی توقع ہے۔ وہ اُس سے ایسا سلوک کرتی ہے۔ کاش! میں اس دنیا میں پیدا ہی نہ ہوتا۔ اور اگر ہوتا تو یوں بابو نہ ہوتا۔ میری مٹی یوں خراب نہ ہوتی۔ آخر میں سکھی سے شکل و عقل میں بڑھ چڑھ کر نہیں؟

سکھ نندن کے جنم دن کو ایک مہینہ ہو گیا۔ تُلا دان کی آئی ہوئی گندم پیسی۔ پیس کر اس کی روٹی بنی۔ بابو کے ماں باپ نے کھائی۔ مگر بابو نے

وہ روٹی کھانے سے انکار کر دیا جتنی دیر نلادان کا آٹا گھر میں رہا۔ وہ روٹی اپنے چچا کے ہاں کھاتا رہا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ جس طرح مانگے تانگے کی چیزیں کھا کھا کر اُس کے ماں باپ کی ذہنیت غلامانہ ہو گئی ہے۔ وہ روٹی کھا کر اُس میں بھی وہ بات آجائے۔ گاڑھے پسینہ کی کمائی ہوئی روٹی سے تو دودھ ٹپکتا ہے مگر حرام کی کمائی سے خون۔ . . . اور غلامی خون بنکر اُسکے رگ و ریشہ میں سما جائے۔ یہ کبھی نہ ہو گا۔ سادھو رام حیران تھا۔ بابو کی ماں حیران تھی۔ چچا جس پر اُس کی روٹی کا بوجھ جبراً پڑ گیا تھا۔ حیران تھے۔ چچی ناک بھوں سکیڑتی تھی اور جب گھر میں اس انوکھے بائیکاٹ کا چرچا ہوتا تو سادھو رام یکدم کپڑوں پر لمبیر پھیرنے، چھوڑ دیتا۔ اور زور زور دانت نکالتے ہوئے کہتا۔

”خی خی . . . بابو ہے نا“

سکھ نندن نے اب بابو میں ایک نمایاں تبدیلی دیکھی۔ بابو جس کام سے جی اچاٹ رہتا تھا۔ اب دن بھر گھاٹ پر اپنے باپ کا ہاتھ بٹاتا۔ بابو اب اس کے ساتھ نہیں کھیلتا تھا۔ ہریا کے تالاب کے کنارے ایک بڑی سی کروٹن چیل پر وہ اور اُسکے دو ایک ساتھی سکول کے وقت کے بعد، گُان پتہ، کھیلا کرتے تھے۔ اب وہ جگہ بالکل سونی پڑی رہتی تھی۔ قریب بیٹھے ہوئے ایک سادھو جن کی کٹیا میں بچے اپنے بستے رکھ دیتے تھے۔ کبھی کبھی چرس کا ایک لمبا کش لگاتے ہوئے پوچھ لیتے ”بیٹا! اب کیوں نہیں آتے

کھیلنے کو۔" اور سکھی نندن کہتا۔" بابو ناراض ہو گیا ہے بادا . . . ." پھر مہاتما جی ہنستے۔ اور چرس کا ایک دم اُلٹا دینے والا کش لگاتے اور کھانستے ہوئے کہتے۔

"اوہوں . . . . . ہوں . . . . . واہ رے پٹھے . . . . . آخر بابو جو ہوا اُلّو!"

اُس وقت سکھی نندن غرور سے کہتا۔" اکڑتا ہے بابو تو اکڑا کرے . . .

. . . اُس کی اوقات کیا ہے دھوبی کے بچے کی؟"

. . . . مگر بچوں کو اپنے ساتھ کھیلنے کے لئے کوئی نہ کوئی چاہیئے کھیل میں کسی طرح کی ذات پات اور درجہ کی تمیز نہیں رہتی۔ حقیقت میں چند سالوں کی ہی تو بات تھی۔ جب کہ وہ یکساں ننگے پیدا ہوئے تھے اور اُس وقت تک اُن میں نادار' لکھ پتی' مہا براہمن' بھنوٹ' ہریجن اور اس قسم کی فضول باتوں کے متعلق خیال آرائی کرنے کی صلاحیت پیدا نہیں ہوئی تھی۔

سکھ نندن اپنی تمام مصنوعی عظمت کو کینچلی کی طرح اتار پھینک بابو کے ہاں گیا۔ بابو اُس وقت دن بھر کام کر کے تھک کر سو رہا تھا۔ ماں نے جھنجوڑ کر جگایا۔ بولی۔" اُٹھ بیٹا . . . . . اب کھیلنے کبھی نہ جاؤ گے کیا؟ سکھی آیا ہے۔" بابو آنکھیں ملتا ہوا اُٹھا۔ چارپائی کے نیچے اُس نے بہت سے

میلے کچیلے اور اُجلے اُجلے کپڑے دیکھے۔ کپڑے جو کہ پیدائش ہی سے ایک سکھی نندن اور بابو میں امتیاز و تفرقہ پیدا کر دیتے ہیں۔۔۔ بابو چارپائی پر سے فرش پر بکھرے ہوئے کپڑوں پر کود پڑا۔ دل میں ایک لطیف گدگدی سی پیدا ہوئی کئی دنوں سے وہ کھیلا نہیں تھا۔ اور اب شاید اپنی اکتسابی رعونت پر پچھتا رہا تھا۔ بابو کا جی چاہتا تھا۔ کہ پھلانگ کر برامدے سے باہر چلا جائے۔ اور سکھی سے بغلگیر۔۔۔ اور کیا انسان کی انسان کے لئے محبت کپڑوں کی حد سے نہیں بڑھ جاتی؟ کیا سکھی کینچلی نہیں اُتار آیا تھا؟ بابو چاہتا تھا کہ دونوں بھائی رہے سہے کپڑے اُتار کر ایک سے ہو جائیں۔ اور خوب کھیلیں، خوب۔۔۔ برآمدے میں کبوتروں کے کابک کے نیچے جالی کے درمیان میں سے بابو کی نظر سکھی پر پڑی، جو پُرامید نظریں اُسکے گھر کے دروازے پر گاڑے کھڑا تھا۔ یکایک بابو کو سکھی کے جنم دن کی بات یاد آگئی۔ وہ دل مسوس کر رہ گیا۔ کبوتروں کی جالی میں اُسے بہت سی بیٹیں نظر آ رہی تھیں، اور بہت سے سراج، الکہ اور دیسی قسم کے کبوتر، گھوں گھوں کرتے ہوئے اپنی گردنوں کو پھلا رہے تھے۔ ایک نر پھول پھول کر مادہ کو اپنی طرف مائل کر رہا تھا۔ بابو نے بھی اپنی گردن کو پھلا لیا۔ اور گھوں گھوں کی سی آواز پیدا کرتا ہوا چارپائی پر واپس جا لیٹا۔ پھر اُسے خیال آیا سکھی دھوپ میں کھڑا جل رہا ہے۔ مگر پھر وہ ایک فیصلہ کن لائحہ عمل

مرتب کرتے ہوئے چارپائی پر آنکھیں بند کرکے لیٹ گیا۔ آخر وہ بھی تو کتنا
ہی عرصہ اُس کے گھر کے صحن میں برسات کی چلچلاتی دھوپ میں کھڑا رہا تھا
اور اُس نے اُس کی کوئی پروانہ کی تھی . . . . امیر ہوگا۔ تو اپنے گھر میں۔

"اسے کہدو . . . . وہ نہیں آئیگا ماں . . . کہو اُسے فرصت
نہیں ہے فرصت" بابو نے کہا۔

"شرم تو نہیں آتی تجھے" ماں نے کہا۔ "اتنے بڑے سیٹھوں کا لڑکا
آوے تجھے بلانے کے لئے اور تو یوں پڑا رہے . . . گدھا!"

بابو نے کہنیاں ہلاتے ہوئے کہا "میں نہیں جانے کا۔ ماں"۔

ماں نے بُرا بھلا کہا۔ تو بابو بولا "سچ سچ کہدوں ماں۔ میں جانتا
ہوں۔ میری کسی کو بھی ضرورت نہیں . . . . . واویلا کرو گی۔ تو میں کہیں
چلا جاؤں گا"

ماں کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ اُس وقت ننھی بلند آواز سے رونے
لگی۔ اور ماں اُسے دودھ پلانے میں مشغول ہوگئی۔

بدھئی کے پروا میں سینتلا (چیچک) کا زور تھا۔ پُروا کی عورتیں
بندریوں کی طرح اپنے اپنے بچوں کو کلیجوں سے لگائے پھرتی تھیں
پڑوسن کی دہلیز تک نہیں پھاندتی تھیں۔ کہیں "بو" نہ پکڑ لیں۔ اور
سینتلا ماتا تو یوں بھی بڑی غصیلی ہیں . . . ڈال چند کی لڑکی، مہا براہمن

کے دو بھتیجے سب کو سیتلا ماتا نے درشن دیا۔ اُن کی مائیں گھنٹوں ان کے سرہانے بیٹھ کر سچے موتیا کے ہار رکھ کر گوری میّا گاتی رہیں۔ اور دیوی ماتا سے پرارتھنا کرتی رہیں۔ کہ ان پر اپنا غصہ نہ نکالے۔ جب بچے راضی ہو جاتے تو مندر میں ماتھا ٹیکنے کے لئے لے جاتیں۔ ماتا تو ہر ایک قسم کی خواہش پوری کرتی تھی۔ جب سیتلا کا غصہ ٹلا اور بُو کچھ کم ہوئی۔ تو پُروا والوں نے سیتلا کی مورتی بنائی۔ اُسے خوب سجایا۔ سکھی نندن کے باپ نے مونگے کی مالا سیتلا ماتا کے گلے میں ڈالی۔ سب نے ملکر عزت و تکریم سے ماتا کو مندر سے نکالا۔ اور ایک سجی ہوئی بہلی میں براجمان کیا۔ اور بہلی کو گھسیٹتے ہوئے گاؤں سے باہر چھوڑنے کے لئے لے گئے۔ پُروا کے سب بوڑھے بچے جلوس میں اکٹھے ہوئے۔ پیتل کی کھڑتالیں، ڈھول ڈھمکے بجتے جا رہے تھے۔ لوگ چاہتے تھے کہ کرودھی ماتا کو ہر یا کے تالاب کے پاس مہاتما جی کی کٹیا کے قریب اُن ہی کی نگہبانی میں چھوڑ دیا جائے۔ تاکہ ماتا اس گاؤں سے کسی دوسرے گاؤں کا رُخ کرے۔ وہ ماتا کو خوشی خوشی روانہ کرنا چاہتے تھے۔ تاکہ اُن پر اُلٹی نہ برس پڑے۔ سکھی بھی جلوس کے ساتھ گیا۔ بابو بھی شامل ہوا۔ نہ بابو کو سکھی کے بلانے کی جرأت پیدا ہوئی۔ نہ سکھی کو بابو کے بلانے کی۔ ہاں کبھی کبھی وہ کنکھیوں سے ایک دوسرے کو دیکھ لیتے تھے۔

ہریا کے تالاب کے پاس ہی دھوبی گھاٹ تھا۔ ایک چھوٹی سی نہر کے ذریعہ تالاب کا پانی گھاٹ کی طرف کھینچ لیا جاتا تھا۔ گھاٹ تھا بہت لمبا چوڑا۔ قریب کے قصبوں میں سے دھوبی کپڑے لے آیا کرتے تھے۔ اسی گھاٹ پر بابو اور اسکے بھائی بند، باپ دادا وہی ایک گانا، اُسی پرانی سُرتال سے گاتے ہوئے کپڑے دھوئے جاتے۔ ایک دن گھاٹ پر سارا دِن بابو سکھی کے بغیر شدت کی تنہائی محسوس کرتا رہا۔ کبھی کبھی اکیلا ہی کروٹن چیل کے بل کھاتے ہوئے تنوں پر چڑھ جاتا اور اتر آتا۔ گویا سکھی کیساتھ کان پتہ کھیل رہا ہو کھیل میں لطف نہ آیا۔ تو وہ اینٹوں کے ڈھیر میں رکھی ہوئی سیتلا ماتا کی مورتی کو دیکھنے لگا۔ اور پوچھنے لگا۔ آیا وہ اس گاؤں سے چلی گئی ہیں یا نہیں۔ ماتا کچھ کروپ (بدشکل، ناراض) دکھائی دیتی تھیں۔ شام کو بابو گھر آیا۔ تو اُسے ہلکا ہلکا تپ تھا۔ جو کہ بڑھتا گیا۔ بابو کو اپنی سدھ بدھ نہ رہی۔ ایک دفعہ بابو کو ہوش آئی۔ تو دیکھا۔ ماں نے موتیا کا ایک ہار اُس کی چارپائی پر رکھا تھا۔ قریب ہی ٹھنڈے پانی سے بھرا ہوا کورا گھڑا تھا۔ گھڑے کے منہ پر بھی موتیا کے ہار پڑے تھے اور ماں ایک نیا خریدا ہوا پنکھا ہلکے ہلکے ہلا ہلا کر منہ میں گوری میّا گنگنا رہی تھی۔ پنکھا مرتے ہوئے آدمی کی نبض کی طرح آہستہ آہستہ ہل رہا تھا۔ اور الگنی پر سُرخ پھلکاریوں کے پردے بابو کی بوڑھی دادی کی جھریوں کی طرح لٹک رہے تھے۔ اور یہ سامان سب کچھ ماتا کی عزت کی وجہ سے کیا گیا تھا

بابو نے اپنی پلکوں پر منوں بوجھ محسوس کیا۔ اُسے تمام بدن پر کانٹے چبھ رہے تھے۔ اور یوں محسوس ہوتا تھا۔ جیسے اُسے کسی بھٹی میں جھونک دیا گیا ہو۔

دو تین دن تو بابو نے پہلو تک نہ بدلا۔ ایک دن ذرا سا افاقہ ہوا۔ صرف اتنا کہ وہ آنکھیں کھول کر دیکھ سکتا تھا۔ آنکھ کھلی تو اس نے دیکھا۔ سکھی اور اس کی ماں دروازے کے قریب بیٹھے ہوئے تھے۔ سیٹھانی نے ناک پر دوپٹہ لے رکھا تھا۔ دراصل وہ دروازے میں اس لئے بیٹھے تھے۔ کہ کہیں بو نہ پکڑ لیں۔ مگر بابو نے سمجھا۔ آج اِن لوگوں کا غرور ٹوٹا ہے۔ اُس نے دل میں ایک خوشی کی لہر محسوس کی۔ ایک جیوتشی جی سادھو رام کو بہت سی باتیں بتا رہے تھے۔ انہوں نے ناریل، بتاشے، مکھنی، منگوائی سادھو رام کبھی کبھار اپنا ہاتھ بابو کے تپتے ہوئے ماتھے پر رکھ دیتا۔ اور کہتا ——

"بابو۔۔۔ او بابو۔۔۔ بیٹا بابو؟"

جواب نہ ملتا۔ تو ایک مکّا سا اس کے کلیجہ میں لگتا۔ اور وہ گم ہو جاتا۔

بابو نے بمشکل تمام کانٹوں کے بستر پر پہلو بدلا۔ پھول ہاتھ سے سرکا کر سرہانے کی طرف رکھ دیئے۔ گلے میں تلخی سی محسوس کی۔ ہاتھ بڑھایا تو ماں نے پانی دیا۔ بابو نے دیکھا۔ اُس کے ایک طرف گندم کا ڈھیر لگا

ہوُا تھا۔ جیوتشی جی کے کہنے پر بابو کی ماں نے اُسے آہستہ سے اُٹھایا۔ اور ایک طرف لٹکتے ہوئے ترازو کے ایک پلڑے میں رکھ دیا۔ ترازو کے دوسرے پلڑے میں گندم اور دوسری اجناس ڈالنی شروع کیں۔ بابو نے اپنے آپ کو تلتا ہوُا دیکھا۔ تو دل میں ایک خاص قسم کا روحانی سکون محسوس کیا۔ چار دن کے بعد آج اُس نے پہلی مرتبہ کچھ کہنے کے لئے زبان کھولی اور اتنا کہا۔

"اماں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کچھ گندم اور ماش کی دال دے دو۔ سکھی کی ماں کو۔ ۔ ۔ ۔ کب سے بیٹھی ہے بچاری۔"

سادھو رام نے پھر اپنا ہاتھ بابو کے تپتے ہوئے ماتھے پر رکھ دیا اُسکی آنکھوں سے آنسوؤں کی چند بوندیں گر کر فرش پر بکھرے ہوئے کپڑوں میں جذب ہو گئیں۔ سادھو رام نے کپڑوں کو ایک طرف ہٹایا۔ اور بولا۔

"پنڈت جی ۔ ۔ ۔ ۔ دان سے بوجھل ٹل جائے گا؟ ۔ ۔ ۔ میں تو گھر بار بیچ دوں ۔ ۔ ۔ پنڈت جی ۔ ۔ ۔"

بابو کی ماں نے سسکیاں لیتے ہوئے سیٹھانی جی کو کہا۔

"مالکن ۔ ۔ ۔ کل نینی تال جاؤگی؟ ۔ ۔ ۔ کل ۔ ۔ ۔ نہیں تو پرسوں ملیں گے کپڑے ۔ ۔ ۔ ہائے مالکن! تمہیں کپڑوں کی پڑی ہے۔"

بابو کو کچھ شک سا گذرا۔ اُس نے پھر تکلیف سے کر پہلو بدلا اور بولا۔

"اماں ۔ ۔ ۔ ۔ اماں ۔ ۔ ۔ آج میرا جنم دن ہے؟"

اب سادھورام کے سوتے پھوٹ پڑے۔ ایک ہاتھ سے گلے کو
دباتے ہوئے بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔
"ہاں بابو بیٹا۔۔۔۔ آج جنم دن ہے تیرا۔۔۔ بابو۔۔۔ بیٹا!"
۔۔۔ بابو نے اپنے جلتے ہوئے جسم اور روح پر سے تمام کپڑے اتار
دیئے۔ گویا ننگا ہو کر سکھی ہو گیا۔ اور منوں بوجھ محسوس کرتے ہوئے آنکھیں
آہستہ آہستہ بند کر لیں!

دس منٹ بارش میں

دس منٹ بارش میں

. . . . ابوبکر روڈ شام کے اندھیرے میں گم ہو رہی ہے۔ یوں دکھائی دیتا ہے۔ جیسے کوئی کشادہ سا راستہ کسی کوئلے کی کان میں جا رہا ہے... سخت بارش میں، دو دو نٹا کی باڑ، سفرینا کا گلاب، قطب سیّد حسین مکّی کے مزار شریف کے کھنڈر میں، ایک کھلتے ہوئے مشکی رنگ کی گھوڑی جس کی پشت نم آلود ہو کر سیاہ ساٹن کی طرح دکھائی دے رہی ہے۔ سب بھیگ رہے ہیں ——— اور راٹا بھیگ رہی ہے!

راٹا کون ہے؟ اسے کلپ برکش کہہ لو یا کام دھین گائے۔ یا اس سے بہتر راٹا ——— راٹا ہے۔ رھرایا لال کی بیوی، ایک دس سالہ کاہل، جاہل، نااہل چھوکرے کی ماں۔ چند ماہ ہوئے۔ تخفیف کے موقع پر ہیوم پائپ کمپنی والوں نے پھرایا لال کو کام سے الگ کر دیا۔ اُس وقت سے اُسکی پُرسکون زندگی میں قسمت کے طوفان گرد باد پیدا ہونے لگے۔ تلاش معاش میں نہ جانے وہ کہاں چلدیا۔ سنا ہے کہ وہ راٹا کو ہمیشہ کے لئے چھوڑ گیا ہے کیونکہ وہ اُس سے محبت کرتی ہے۔ اور جس شخص میں محبت کی سی کمزوری ہو۔ وہ پائے استحقار سے ٹھکرا دیا جاتا ہے... مرچو تیزابی کا بیان ہے

کہ پوہ کے ایک سرد، نیلے سے دھند لکے میں اُسی نے پھرایا لال کو اپنی ہی برادری کی ایک عورت کے ساتھ جاتے دیکھا تھا۔ وہی عورت —— کوڑی، جو ابوبکر روڈ کے مکانوں میں سے گملے اٹھایا کرتی تھی۔ ان دنوں پھرایا لال بیکار تھا۔ بیکار انسان کے عقل و فکر میں خونِ جگر پینے یا کثرت سے محبت کرنے کے سوا اور کچھ نہیں سماتا۔ بعضوں نے پھرایا کو کوٹ پتلی میں صفیں بناتے ہوئے دیکھا ہے۔ قریب ہی کوڑی ایک غیر آدمی کے ساتھ مسکرا مسکرا کر باتیں کر رہی تھی . . . . رانا پھر بھی پھرایا لال کو دل سے چاہتی ہے۔ یہ محبت اور جنوں کے انداز میں کبھی چھٹتے ہیں؟.... اور رانا بھیگ رہی ہے!

رانا کی مشکی گھوڑی ابوبکر روڈ پر ہماری کوٹھی کے سامنے گھوم رہی ہے۔ وہ اُس کا شب دیجور کا سا رنگ! . . . . صرف اسکے ہنہنانے اور کبھی بجلی کے کوندنے سے اُس کے وجود کا علم ہوتا ہے۔ صبح سے بیچاری کو دانہ نہیں دیا گیا۔ نہ ہی اُس کی موچ والی ٹانگ پر ہلدی لگائی گئی ہے، بھوک کی شدت سے بے بس اور بگڑ کر وہ آوارہ ہو رہی ہے۔ شاید پھرایا کو ڈھونڈتی ہوگی۔ پھرایا —— جو اسے بھی چھوڑ کر کوڑی کے ساتھ چلا گیا ہے۔ کوڑی جو کوٹ پتلی میں کسی دوسرے مرد کے ساتھ مسکرا مسکرا کر باتیں کر رہی تھی۔ ایک وقت میں ایک دل کے

اندر مشکی گھوڑی رہ سکتی ہے۔ یا گوری یا گوری یا راٹا۔ ۔ ۔ اور بھو کی مشکی گھوڑی ہنہناتی ہے جیسے کبھی سکندر سے جدا ہونے پر بوُس فیلس ہنہناتا تھا۔!

راٹا اپنے سر سے بوریئے کی اوڑھنی اٹھا کر پوچھتی ہے۔

"بالوجی ــــــ آپ نے یہاں رامی نہیں دیکھی؟ ۔ ۔ ۔ رامی ۔ ۔ ۔ ۔ میری مشکی گھوڑی؟"

میں نے کہا۔" رامی؟ کون رامی؟ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اچھا رامی تمہاری مشکی گھوڑی۔ اری! وہ ورونٹا کی باڑ کے پیچھے تو کھڑی ہے۔ تمہیں دکھائی نہیں دیتی کیا؟"

راٹا آنکھوں کو سکیڑ کر باڑ کی طرف دیکھتی ہے۔ حقیقت یہ ہے۔ جب کھلتے ہوئے مشکی رنگ کی گھوڑی شام کے وقت بارش میں بھیگ جاتی ہے تو وہ بھی شبِ دیجور کا ایک جزو بن جاتی ہے، اور بے نور اور وہ کر جوت گنوائی آنکھوں کو اُسے تاریکیٔ شام یا شامِ تاریکی سے جُدا کرنا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بارش کی رم جھم، سرس کی لمبی لمبی پھلیوں کی کھڑ کھڑ، گرتے ہوئے پتوں کے نوحے، رعد کی گرج، بطخوں کی بط بط۔ ۔ مینڈکوں کی ٹراہٹ، پرنالوں کے شور، اس کتیا کی اونہہ ــــــ اونہہ، جس نے ابھی ابھی سات بچوں کا جھول جنا ہے۔ اور ایک بچے کو منہ میں پکڑے

کسی سوکھی، نرم وگرم جگہ کی متلاشی ہے۔ ان سب کے شور وغوغا میں بھو کی گھوڑی کی جگر دوز ہنہناہٹ علیحدہ سنائی دیتی ہے۔

پراشر کہتا ہے "میں بھیگ رہا ہوں ...... اور وہ بھی بھیگ رہی ہے۔"

ماں خفا ہوتے ہوئے کہتی ہے "گیلا ... گیلا ... گیلا ... تنور بالکل گرنے والا ہو گیا ہے۔ ایں؟ یہ موئی کتیا تنور میں چھپی بیٹھی ہے میرا تنور گر جائے گا۔ یہ بیوقت کی بارشیں، رام رے! ...."

ننھے بشن کا فراک گر کر صحن میں یوں پڑا ہوا یوں دکھائی دیتا ہے۔ جیسے کوئی مری ہوئی فاختہ ہو، ماں ناراض ہے۔ کہ میں نے بشن کا فراک کیوں نہیں اٹھایا۔ حالانکہ راٹھا کی گھوڑی پکڑنے میں میں سر سے پاؤں تک بھیگ گیا۔ ماں اس لئے بھی خفا ہے۔ کہ میں پراشر سے آوارہ مزاج نوجوان کے ساتھ بارش میں لنگوٹا باندھ کر نہانے کے لئے چلا ہوں۔ ماں کا خیال ہے کہ میں بھی اس کے ساتھ رہ کر آوارہ ہو جاؤں گا۔ حقیقت میں ماں کے ماتھے پر تیور اس لئے ہیں۔ کہ میں نے راٹھا کو مشکی گھوڑی پکڑنے میں مدد دی ہے۔ گھوڑی کو شام کی تاریکی سے علیحدہ کرتے ہوئے اس کی ایال راٹھا کے ہاتھ میں دیدی ہے اور اس فعل کے ارتکاب میں اس سے چھو گیا ہوں۔

میں نے کہا "اسی پراسچت میں تو میں نہا رہا ہوں، ماں۔"

حقیقت تو یہ ہے۔ کہ اس قسم کی آلودگی کو میں پسند کرتا ہوں، پر انشر کا کیا وہ تو ہر قسم کی آلودگی کو پسند کرتا ہے۔ ۔ ۔ کاش ابھرا یا لال کبھی نہ آئے اور راٹا کو ہر ایک کام کے لئے ہمارا مرہون منت ہونا پڑے۔ کیا وہ گھوڑی ہی پکڑوائے گی؛ اور کوئی کام نہیں کہے گی؟

ماں کہتی ہے۔ لوہار، بڑھئی، چمڑہ رنگنے والے ایک برہمن کو چوبیس قدم، چار و من بونے والے اڑتالیس قدم، موٹا مانس کھانے والے چونسٹھ قدم پر سے بھرشٹ کر سکتے ہیں۔ مگر میں ماں کو کہتا ہوں، ماں! ان لوگوں کی وجہ سے تو ہم زندہ ہیں۔ براہمن کھیتی کی یہ لوگ باڑ ہیں۔ ۔ ۔ اور پھر تھوڑی بہت برائی سچائی کو بچانے کے لئے روز ازل سے زندہ ہے۔ ماں کہتی ہے۔ کل جگ ہے بیٹا گھور کل جگ!

بظاہر ماں شن سے باتیں کرتی ہے۔ مگر در اصل اس کا مقصد سب کچھ مجھے سنانا ہوتا ہے۔ "مہا یگیہ برہما کا ایک دن ہے۔ کرت کریتا، دواپر اتنے لاکھ برسوں کے ہیں۔ کل جگ چار لاکھ بتیس ہزار برسوں کا ہے۔ پچھلے برس چیت کے مہینہ میں کل جگ کو صرف پانچ ہزار چھبیس برس گذرے ہیں۔ رام جانے ابھی کتنے باقی ہیں ـــــ اور یہ بے وقت کی بارشیں!"

"بارش نے کافی سردی پیدا کر دی ہے۔" میں نے کہا۔

"ہاں بھائی۔ ۔ ۔ میرے تو دانت بجنے لگے۔ ۔ ۔ چلو برآمدہ میں

چلیں "

" لیکن . . . . ابھی بہت وقت تو نہیں ہوا "

" چائے بنوا دو نا —— سردی ہو رہی ہے "

" چائے بن جائے گی۔ سگرٹ نہیں ملیں گے "

" کوئی بات نہیں ! بیڑیاں جو ہیں میرے کوٹ کی جیب میں "

" ہمارے ٹی سنڈیکیٹ کو آجکل بارش بہت فائدہ مند ہے "

" ہاں —— چائے کے پودوں کی ڈھلوان جنوب کی طرف ہے ! ابوبکر روڈ کا نام پانی ادھر نہیں جاتا . مگر زیادہ بوچھاڑ چائے کے پودوں کیلئے نقصان دہ ہے . جڑیں گل جانے کا اندیشہ ہے . ہلکی ہلکی پھوار کا تو کہنا ہی کیا . . . . . کچھ بھی ہو۔ یہ بارش ایسوسی ایٹڈ ٹی سنڈیکیٹ کے لئے فائدہ مند ثابت ہوگی . ہماری آمدنی بڑھ جائے گی . کیوں ؟ ہے نا "

" ہاں "

" ایشور اپنی دیا بارش کے ذریعہ بھیجتا ہے "

" ہاں —— دیا . . . . . آمدنی —— ارے ! راٹا کی جھونپڑی کی کھپریل اڑ رہی ہے "

" ایشور کی دیا . . . "

اب بارش بہت زیادہ ہونے لگی ہے . گویا سب کی سب ابوبکر روڈ

پر ہی برس پڑے گی۔ نکٹیسر کے پتے بطخ کے پروں کی طرح بھگتے نہیں پانی کے قطرے ان پر پارے کی طرح لڑھکتے ہیں۔ کہیں کہیں اٹک کر ایک مدوّر ہیرے کی طرح دکھائی دیتے ہیں۔ کچھ عرصہ بعد ایک اور قطرہ وہیں ٹپکتا ہے تو ہیرا زیادہ مدوّر اور بڑا ہو جاتا ہے۔ مگر نازک نازک رات کی رانی کے پھول اس بوچھاڑ کی تاب نہیں لا سکتے۔۔۔۔ ابوبکر روڈ کے دورویہ کوٹھیوں میں بسنے والے نکٹیسر کے پتوں کی طرح ہیں۔ بارش ان کی سلیٹ کی چھتوں پر سے بہتی لڑھکتی ہوئی ابوبکر روڈ پر آ رہی ہے۔ بارش کے قطرے ان کے لئے مدوّر ہیرے ہیں۔۔۔۔ مگر رات کی رانی ـــــ راتا سر بھینکدیتی ہے گاہے گاہے سر اُٹھا کر کھپریل کو باندھنا شروع کر دیتی ہے۔ اور اپنے بھگتے ہوئے بالوں کی وجہ سے دوگن ویلیا کی حسین بیل دکھائی دیتی ہے۔

پہلے بچاری مشکی گھوڑی کو ڈھونڈتی پھرتی تھی۔ اب یہ اس کیلئے ایک نئی مصیبت ہے۔ جھونپڑی کی تمام چھت سے پانی بہنے لگا ہے۔ بوریئے کی اوڑھنی تو محض رسمی پناہ ہے۔ اس کے تمام کپڑے بھیگ کر جسم کے ساتھ چپک گئے ہیں۔ شام کے اندھیرے میں جب بجلی چمکتی ہے، تو وہ عریاں سی دکھائی دیتی ہے۔

بارش میں ایشور کی دیا سے کوئی نرم و گرم جامے زیب تن کرتا ہے تو کوئی عریاں ہو جاتا ہے۔ کسی کی آمدنی دوگنی ہو جاتی ہے۔ تو کسی کی کھپریل

ٹوٹ جاتی ہے ۔۔۔ کوئی شب سمور گداز ہوتا ہے کوئی شب تنور !

دوگن ویلیا کی بیل کو جب تند ہوا ہلاتی ہے ۔ تو یوں دکھائی دیتا ہے گویا کوئی حسینہ سرد ہونے کے بعد لب بام اپنے چمکیلے سیاہ بالوں کو زور سے نچوڑ کر دونوں ہاتھوں سے چھانٹتی ہے ۔ راٹا کا بے عقل، کاہل —— پاگل لڑکا جھونپڑی میں سویا پڑا ہے ۔ بجھتے ہوئے چولہے کے پاس اگرم ہو کر —— اگر وہ جاگتا ہوتا ۔ تو مشکی گھوڑی پکڑنے کے لئے اُس کی ماں کو میرا مرہونِ منت نہ ہونا پڑتا ۔۔۔۔ پھر ایا لال تو چلا ہی گیا ہے ۔ کاش ! وہ کاہل لڑکا ہمیشہ کی نیند سو جائے !

شاید راٹا کھپریل بندھوانے کے لئے ہمیں بلائے ۔ اس کے بارش کی وجہ سے بدن کے ساتھ چپکے ہوئے کپڑے ! بجلی کی چمک میں اس کا بدن کتنا خوبصورت اور سڈول دکھائی دیتا ہے ۔ لیکن ماں ۔۔۔۔ ماں کہتی ہے کل جگ ہے ۔

—— کلکتہ کی مارکٹ میں چائے کتنی بکے گی ؟ کتنی دساور کو جائیگی میری آمدنی بڑھ جائے گی ۔ پراشر کی بھی ۔۔۔۔ لیکن وہ کمبخت بڑیاں پیئے گا ۔ چائے کے پیالوں کے پیالے اور شراب اور ۔۔۔۔۔۔

"مجھے نکلے گلٹی ، ہیضے کے توڑے ۔۔۔ ۔ سونے کا سویا رہ جائے تو ۔۔۔ ۔" راٹا اپنے چھوکرے کو گالیاں دیتی ہے ۔

راٹا کو جانے کی ضرورت نہیں۔ گالیاں دیتے ہوئے اُس کے جسم میں کافی گرمی آگئی ہے۔ وہ نکما سست لڑکا، اُس کے ساتھ کھپریل بھی تو نہیں بندھوا تا۔ آرام سے بجھتے ہوئے چولہے کے پاس پڑ رہا ہے۔ پانی کی چھینٹیں پڑتی ہیں، تو ٹانگیں سکیڑ لیتا ہے۔ جب اندر پانی ہی پانی ہو جائے گا تو وہ آنکھیں ملتا ہؤا اُٹھے گا۔ صرف یہ کہے گا۔ ماں کیا بات ہے۔ جو اتنا شور مچا رکھا ہے؟ چین سے سونے بھی نہیں دیتی۔ جیسے کوئی بات ہی نہیں وہ تو شاید یہ بھی کہے ہیں ایسی عورت کے گھر کیوں پیدا ہؤا جو ایسی ایسی گالیاں دیتی ہے۔ جیسے میری کوئی بھی ضرورت نہیں۔ کہتی ہے سوئے کا سو یارہ جائے تو ... وہ بیوقوف کیا جانے کہ جب ماں یہ کہتی ہے کہ تو سوئے کا سو یارہ جائے۔ تو اُس وقت وہ اُسے ہمیشہ کی نیند سے بچانے کے لئے طوفانِ بادو باراں میں تن تنہا بے یارو مددگار اپنی جان تک لڑا دیتی ہے۔

ابھی انتہائی گرسنگی کی وجہ سے اس کی مشکی گھوڑی ہنہنا رہی تھی۔ جیسے سکندر سے جدا ہونے پر بوس فیلس ہنہناتا تھا۔ مگر اب وہ خاموش ہے۔ شاید اس نے راٹا کی بے بسی کو دیکھ لیا ہے۔ اور پھر ایا کے پیار کو ——— اب وہ کبھی نہیں ہنہنائے گی!

پرانشر بولا " وہ ایک مرتبہ مدد کے لئے اشارہ تو کرے "۔

" ہاں ——— اور ہم دونو . . . . . " میں نے جواب دیا۔

"میں کہتا ہوں۔کیوں نہ ہم خود ہی چلے جائیں؟"

"مگر ماں کہتی ہے۔کل جگ کو صرف پانچہزار برس گذرے ہیں۔رام جانے ابھی کتنے باقی ہیں"

پھر وہی گالیاں . . . . .

"تجھے آدے ڈھائی گھڑی کی . . . . . نکلے تیرا جنازہ لچلچاتا وا . . . . گور میں پڑے . . . . . خون تھوکے تو . . . . "

شاید وہ چھوکرا سوچتا ہوگا۔میں کیوں اس عورت کے گھر پیدا ہوگیا جو مجھے گور میں بھیجنا چاہتی ہے۔وہ بے وقوف کیا جانے، کہ حقیقت میں وہ اُسے آپ ہی گور سے بچانے کے لئے اپنی جان تک لڑا رہی ہے۔وہ دس سالہ بے عمل، غافل کاہل چھوکرا اب تک اپنی جگہ سے نہیں ٹلا۔صرف اس لئے کہ راٹا کو اس سے محبت ہے۔جس کا اس جوانامرگ کو اچھی طرح سے احساس ہے۔وہی راٹا کی زندگی کا سہارا ہے۔وہی اس کی آنکھوں کا نور ہے اسی لئے تو وہ بے کس اور اندھی ہے . . . . اگر راٹا پھرایالال کو محبت نہ کرتی۔اگر وہ اس چھوکرے پر اپنی تمام امیدیں نہ لگا دیتی تو سکھی ہو جاتی۔

ابو بکر روڈ متحرک ہو کر کوئلے کی کان میں جاتی ہوئی دکھائی دیتی ہے بہاؤ کے خلاف ایک دہقان بھیگتا ہوا آہستہ آہستہ اسی جانب آرہا ہے۔اس کے ہاتھ میں ایک بیل کی رسّی ہے۔شاید وہ بیل کو کہیں سے چرا لایا

ہے۔ غالباً اُس کی خواہش ہے۔ کہ ہم اسے برآمدے میں کچھ دیر ٹھہرنے کے لئے جگہ دیں۔ اور یہ ممکن نہیں، کون جانے بیل گوبر سے برآمدے کا فرش خراب کر دے۔ اور مال . . . پھر چوری کے مال کو اپنے پاس رکھنا . . .

"بابوجی سلام" دہقان بولا۔

"سلام" پراشر نے زیر لب کہا۔

پھر وہ اپنے کانپتے ہوئے ہاتھوں میں سے ایک گیلا کاغذ پراشر کے ہاتھ میں دے دیتا ہے —— پروانہ راہداری . . . یہ اس بات کا ثبوت ہے، کہ بیل چوری کا مال نہیں، اپنا ہے۔ جسے وہ تال محل کی منڈی میں بیچنے کے لئے لے جا رہا ہے۔

باعث تحریر آنکہ

ایک راس گاؤ نر، جسکے سینگ اندر کو مڑے ہوئے ہیں، دم کے سیاہ بالوں میں سفید . . . . . .

—— اور باقی کا بارش نے دھو دیا ہے۔ کتنے بے ربط ہوتے ہیں، یہ دہقان لوگ، پہلے سینگ اور پھر دم، بعد المشرقین، ان کے لئے گویا دم اور سینگوں کے درمیان کوئی جگہ ہی نہیں۔ جسم کا رنگ پہلے آنا چاہیئے تھا۔ مخملیں جسم! جو بارش میں گیلا ہو کر سفید ساٹن کی طرح دکھائی دیتا ہے۔ اندھیرے اس کا سفید رنگ نظر آتا ہے۔ مگر جب بجلی چمکتی ہے، تو بیل

بجلی کا ایک جز و بن جاتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ بیل تمام زور لگا کر ہانکتا ہے ۔
جیسے شوجی مہاراج کو دیکھ کر پیار سے ان کا نندی گن ہانک رہا ہو۔ بیل
صبح سے بھوکا ہے ۔ مگر اپنے بوڑھے، مکروہ شکل مالک کو پیار کئے جاتا ہے
اگرچہ عقل حیوانی سے جانتا ہے کہ بوڑھا کل اسے تال محل کی منڈی میں بیچ
ڈالے گا ۔ ہائے! یہ محبت اور جنون کے انداز بھی کبھی چھٹتے ہیں؟"

"کیوں بیچتے ہو اتنے خوبصورت بیل کو؟"

"بابوجی ۔ ۔ ۔ ۔ فصلیں تباہ ہو گئی ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ اور مالیہ دینا ہے ۔ ۔ ۔
۔ ۔ ۔ ۔ اُف! یہ بے وقت کی بارشیں ۔ کیا میں اندر آجاؤں اس چھت
کے نیچے؟"

"اوہوں —— تمہارا یہ بیل گوبر سے برآمدے کو خراب کر دے گا۔"

"میں صاف کر دوں گا بابوجی! —— شیشے کی طرح ۔ ۔ ۔ بیل صبح
سے بھوکا ہے ۔ اتنی سردی کہاں برداشت کرے گا ۔ اور پھر دوسری بات
نہیں ۔ فقط یہ پروانہ راہ داری دھل گیا، تو یہ بیل چوری کا مال سمجھا جائیگا
تال محل کا تھانے دار جہاں خاں بڑا اکڑ وا آدمی ہے ۔ مار مار کر ادھ موا کر دیگا
بیل جاتا رہے گا ۔ تال محل میں اس بیل کی قیمت پر ہی تمام امیدیں لگا
رکھی ہیں ۔ ۔ ۔ ہائے! یہ بے وقت کی بارشیں ۔ ۔ ۔ ۔

"جاؤ" پراشر نے کہا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ "ہم تمہیں یہاں جگہ نہیں دے

سکتے" . . . جھاؤ . . ."

دہقان سہم کر چلا گیا۔ کبھی کبھی پیچھے مڑ کر دیکھ لیتا۔ گو یا رات کو ہمارے ہاں ہی سیندھ لگائے گا"۔ اگر وہ سیندھ لگائے بھی تو حق بجانب ہے" میں نے سوچتے ہوئے کہا۔

بیل ابو بکر روڈ کے چوک پر گر پڑا ہے، وہ دہقان کے اُٹھائے . . . کسی کے اٹھائے نہ اُٹھیگا۔ وہ نندی گن کیطرح دہقان کو دیکھکر کبھی نہیں ہانک لگائیگا!

پھر میں نے پراشر سے کہا۔ "چائے تیار ہے بھائی ـــــ کتنی پیالیاں پیوگے تم؟

"چھ"

"پارہ شر . . . اور ورجن بیڑیاں ؛ کہدو ہاں"

"زیادہ . . ."

"چھی"

ـــــ بارش اور بھی تیز ہو رہی ہے اور . . . اور راٹا کی گالیوں کی بارش بھی!

راٹا کی کھپریل گر چکی ہے۔ دیواروں میں شگاف ہو گئے ہیں۔ قریب ہی ایک سیٹھ کے سہ منزلہ مکان کا پرنالہ راٹا کی جھونپڑی پر گرنے لگا ہے۔ جھونپڑی کے ارد گرد ابو بکر روڈ پر چلتے ہوئے پانی کو دیکھ کر طوفانِ نوح کا خیال آتا ہے۔ کیا ہم راٹا کی مدد کر سکتے ہیں؟ باوجود کل جگ کے . . .

ہمارے برآمدے کے سوا اور کوئی نزدیک پناہ بھی تو نہیں ہے۔ پراشر خوش ہے۔ اسکے پاس چلئے ہے۔ بیڑیاں ہیں . . . . اور بے پناہ راٹا ادھر آ ہی جائے گی . . . ."

راٹا چاروں طرف دیکھ رہی ہے۔ پراشر کہتا ہے۔

" ابھی وہ کہے گی۔ مجھے اپنے دامن میں چھپا لو بابو جی "

" کبھی نہیں " میں نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

" تو اس کے سوا اسے چارہ ہی کیا ہے ؟ "

" یہ بارش کا دامن کیا اسکے لئے کم ہے ؟ . . . راٹا کی سی عورت کو میں جانتا ہوں . . . جب کسی ایسے انسان پر عزت کے دامن تنگ ہو جاتے ہیں . . . تو خود بخود ایک بہت بڑا دامن اسکے لئے کھل جاتا ہے . . . . "

— اور راٹا کی تو مٹھیاں بند ہیں کبھی کبھی وہ دانت پیستے ہوئے چیختی ہے —

" جوان مرے . . . . . کلموئے . . . .

. . . . میں نے تو رو لیا تجھے بے چین ! "

حبائیں بُ

حیاتین ب

ایجرٹن روڈ کے عین وسط میں جہاں جلی حروف میں "روڈ اپ" لکھا ہوا تھا، اور نصف درجن کے قریب سرخ پھریرے ہوا میں لہرا رہے تھے۔ میں بطور ایک چھوٹے اوورسیر کے مزدوروں کے کام کی نگرانی کر رہا تھا۔ میرے ہاتھ میں ایک بہت لمبا ٹیپ تھا۔ جس سے بار بار مجھے مرمت طلب سڑک اور کٹی ہوئی روڑی کی پیمائش کرنی پڑتی تھی۔

'روڈ اپ' بورڈ کے پاس ہی کولتار کے چند خالی پیپے پڑے تھے، اور اُن پر سرخ شیشوں والی بتیاں رات کے وقت استعمال کے لئے اقلیدسی نصف دائرہ میں پڑی تھیں۔ قریب ہی پگڈنڈی میں چند گہرے سے گڑھے نظر آ رہے تھے۔ اُن گڑھوں کو بطور چولھے کے استعمال کرتے ہوئے سڑک کے مرمت شدہ حصے پر بچھانے کے لئے کولتار کو گرم کیا جا رہا تھا۔ اور دُور ایک چیختا چلاتا ہوا انجن بچھی ہوئی کنکریوں کو دبا رہا تھا۔

پھریروں اور خالی ٹینوں کے ساتھ ہی چند مارواڑی اور پوربی عورتیں سڑک کے مرمت طلب قطعہ زمین کو بڑے بڑے برشوں سے صاف کر رہی تھیں۔ اور اپنے مخصوص سُر تال سے گا کر اپنے کام میں روح پھونک

رہی تھیں۔ پاس ہی سول لائن کے تھانے اور ایک بڑی سی نرسری کے درمیان ایک لہسوڑے کے نیچے دو ایک بچے بلک رہے تھے۔ نرسری میں چند ایک چھوکرے غلیلیں اور گوپھیے ہاتھوں لئے ثمر آور پودوں سے طوطوں وغیرہ کو اڑا رہے تھے۔ کنکری چھوڑتے وقت وہ بلند آواز سے اللہ اکبر پکارتے کبھی کبھی بے وجہ چیختے یا زور زور ہنستے اور اپنی آواز کی گونج سے حظ اٹھاتے۔ میری توجہ نرسری کی طرف لہسوڑے کے نیچے بلکتے ہوئے بچوں کی طرف منعطف ہو گئی، بچوں کے پیٹ پھولے ہوئے تھے۔ اور اُن کی چھاتیاں اندر کو دھنس گئی تھیں۔ جب کوئی مارواڑی یا پوربی عورت اپنے بچے کو دودھ پلانے کے لئے اُٹھتی تو ٹھیکیدار عرفانی خشم آلود نگاہوں سے اس کی طرف دیکھنے لگتا، مگر جیسے ہی پس پشت گرگراتا ہوا انجن سیٹی دیتا۔ عرفانی اچھل کر انجن کی زد سے باہر پٹڑی پر کھڑا ہو جاتا۔

اس دفعہ ٹھیکیدار عرفانی نے ٹنڈر بہت کم رقم کا بھرا تھا، اس لئے مزدوروں پر سخت نگرانی تھی۔ سستانا، گرگڑی کے کش لگانا، دن میں دو دفعہ سے زیادہ پیشاب کے لئے کام کو چھوڑنا قواعد کے خلاف تھا، بچوں کو ایک دفعہ سے زیادہ دودھ پلانے کی اجازت نہ تھی، ماوریت کے پھلنے پھولنے یا پیدائش کی شرح کا کسی کو خیال نہ تھا۔ اور نہ حکومت کی طرف سے کوئی آسائش مہیا تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا۔ جیسے وہ بلکتے ہوئے

بچے بھوک سے نڈھال ہو کر مر جائیں گے۔

جمعدار رام اوتار کی مدد سے میں پگڈنڈی پر پڑی ہوئی روڑی کو ناپنے لگا۔ روڑی ساڑھے تین فٹ چوڑی اور آٹھ فٹ لمبی اور ایک فٹ اونچی تھی۔ اور میرے اندازے کے مطابق ایک بڑے سے بیضوی گڑھے کے لئے کافی تھی۔ اس وقت میں نے ماتادین کو اپنے ساتھیوں سے علیحدہ ہو کر سستانے کی خاطر بیٹھتے دیکھا۔ ماتادین ایک ادھیڑ عمر کا پوربی مزدور تھا۔ ذات اس کی کوری تھی۔ جسم کے لحاظ سے وہ باقی مزدوروں سے کہیں اچھا تھا۔ دھوپ میں ماتادین کا پسینہ سے شرابور سیاہ رنگت کا عریاں تنومند جسم ایک بڑے سے کانسی کے مجسمے کی مانند دکھائی دیتا تھا۔

ماتادین کو اس حالت میں دیکھ کر میں نے ٹیپ کو جمعدار رام اوتار کے حوالہ کیا اور دوڑ کر ایک چھلانگ کر ماتادین کے پاس جا پہنچا۔ اور بلند آواز سے چیخا۔ . . . "ہے . . . . ماتادین۔"

ماتادین گھبرا کر اٹھ بیٹھا، اور اپنی خمار آلود نگاہیں مجھ پر ڈالتے ہوئے بولا۔ "مالک!"

"ہاں! مالک . . . . آرام کر رہے تھے نا؟ . . . . شاید تم عرفانی کے مزاج سے اچھی طرح واقف نہیں ہوئے۔"

"رات بھر جاگتا رہا ہوں۔ اس لئے ذرا . . . ."

"یہ کوئی وجہ نہیں۔"

ماتا دین ایک مہیب انداز سے مسکرا کر اپنے کام میں مشغول ہو گیا؛ اُس کے بدشکل چہرے میں مسوڑھے پھول کر بڑے بڑے گھناؤنے دانتوں کو گویا چھوڑ رہے تھے۔ وہ روڑی کوٹتے ہوئے بولا۔

"کام چور نہیں ہوں مالک . . . . آپ جانتے ہیں میں تو دو ٹکیوں میں کام کئے جاتا ہوں مگر . . . ."

ماتا دین ایک ایماندار مزدور تھا۔ وہ باقی مزدوروں سے زیادہ ذہین تھا۔ اُسے دوبارہ بات سمجھانے کی ضرورت کبھی نہیں پیش ہوئی تھی۔ صبح جب اسی سڑک پر سورج کی پہلی ٹکیہ مشرق کی طرف نرسری کے چھوٹے چھوٹے درختوں کے پیچھے سے نمودار ہوتی، اس وقت سے لے کر شام تک جب کہ دوسری ٹکیہ مغرب کی طرف شہر کے مکانوں کے بے ربط منڈیروں کی طلائی مغزی ادھیڑتے ہوئے ڈوب جاتی، وہ دو ٹکیوں میں برابر کام کئے جاتا۔ اسی اثنا میں گردو غبار سے سینہ صاف کرنے کے لئے ماتا دین کوڑی بھر پشاوری گڑ کھاتا۔ اور چھپ کر ایک آدھ گرگڑی کا کش لگاتا۔ میں نے اس سے پہلے کبھی اُسے دم لیتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔

عرفانی نظر سے اوجھل کھڑا تھا۔ اپنی ذمہ داری کا احساس دلانے کے بعد میں نے ماتا دین سے پوچھا۔

"عرصہ سے من بھری ان عورتوں میں دکھائی نہیں دیتی . . . اچھی تو ہے نا؟"

"اجی کہاں اچھی ہے" ماناڈین بولا" اسی کے لئے تو رات کو جاگنا پڑتا ہے اور دن کو میری یہ دشا ہوتی ہے۔"

مجھے ایک مخدوش سے قطعہ زمین کی طرف متوجہ ہونا پڑا۔ یہ وہ جگہ تھی جہاں سڑک کے ایک دم مغرب کی طرف مڑ جانے کی وجہ سے انجن کے پہیے پہنچنے سے قاصر تھے۔ مگر میری توجہ کو اپنی طرف کھینچتے ہوئے ماناڈین بولا۔

"مالک . . . . . اسے بیری بیری ہو گئی ہے۔ شاید مجھے یہ نوکری چھوڑنی پڑے۔"

"بیری بیری؟" میں نے اپنے شانوں کو جھٹکا دیتے ہوئے کہا۔" میں نہیں جانتا بیری بیری کیا ہوتی ہے؟"

ماناڈین بولا۔" آپ بیری بیری بھی نہیں جانتے . . . . آپ سے پڑھے لکھے آدمی نہ جانیں گے تو اور کون جانے گا؟"

—— اور ایک مسنغار سی مسکراہٹ ماناڈین کے چہرے پر لڑھکنے لگی۔ اس نے اپنی پھٹی ہوئی دھوتی کے ایک پلّے کو کمر سے نکالا اور کپڑے کی کئی تہوں میں سے کاغذ کے ایک خستہ ٹکڑے کو برآمد کرتے ہوئے میرے

ہاتھ میں دے دیا، وہ لال جی بھارتی جی خیراتی ہسپتال کی تشخیصی پرچی تھی۔ مرض کا نام بیری بیری لکھا تھا۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ پٹھوں میں ورم ہو جانے کو بیری بیری کہتے ہیں، اور یہ مرض خوراک میں حیاتین ب کے کافی مقدار میں موجود نہ ہونے کا لازمی نتیجہ ہے۔

"تو کیا من بھری کے پٹھوں میں ورم ہو چکے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

ماتا دین نے انگوٹھے اور انگلی سے ایک بڑے سے سوراخ کی شکل پیدا کرتے ہوئے کہا۔ "اتنے بڑے . . . سرکار۔"

میرے جسم میں ایک سنسنی سی دوڑ گئی۔

ماتا دین کہنے لگا۔ "اُسے خوراک اچھی نہیں ملتی . . . ڈاکٹر کی رپٹ دیکھی ہے نا آپ نے؟ اس نے گول مانس، انڈے، مکھن اور پنیر کھلانے کے لئے کہا ہے۔"

اس وقت میں سوچنے لگا۔ بھلا روکھی سوکھی دال چپاتی میں سے من بھری کیونکر حیاتین ب اخذ کر سکتی ہے۔ اگرچہ کوری، کرمی اور نیچ ذات کے پوربی لوگ گوشت کھا لیتے ہیں۔ مگر ماتا دین پٹھوں کا نرم نرم گوشت، انڈے، مکھن، پنیر، ٹماٹر اور اس قسم کی امیرانہ خوراک کہاں سے مہیا کریگا جہاں تک میرا خیال تھا، اس نے تو عرصہ سے سبزی بھی استعمال نہ کی تھی۔ اور اپنے گاؤں سے کسی بھائی بند کے ہاتھ مسور کی دال منگوا رکھی تھی۔

جسے وہ صبح وشام کھاتا تھا۔ تبھی تو اُسے دانتوں کی سکروی (SCURVY) تھی۔ سکروی، خوراک میں حیاتین ج کے مفقود ہونے کا نتیجہ ہے اسکے مسوڑھے بہت زیادہ پھول کر ٹیڑھے میڑھے دانتوں کو چھوڑ رہے تھے۔ میں نے کہا،" خواہ کسی ماتادین یا گنگا دین کی جورو من بھری سے زیادہ خوبصورت ہو۔ اور کوئی اسکے لیئے ماتادین سے زیادہ جفاکشی کرے۔ مکھن، پنیر کی سی خوراک مہیا نہیں کر سکتا۔ اسکے بعد میں اس ڈاکٹر کی حماقت پر ہنسنے لگا۔ جس نے بیری بیری کا نام ماتادین کے ذہن نشین کرا دیا تھا۔ اور اس قسم کی خوراک بطور علاج کے لکھ دی تھی۔ ماتادین کے بیان کے مطابق ڈاکٹر کا اپنا رنگ سنگرپھی (شنگرفی) ہو رہا تھا۔ کوئی جانے، "خون پھٹ کر باہر آجائے گا"۔ ڈاکٹر نے ماتادین کو وہ دوائی کی بوتل بھی دکھائی تھی، جس میں حیاتین ب کا جزو کافی مقدار میں موجود تھا۔

یکایک مجھے یاد آیا۔ ماتادین کام چھوڑنے کے متعلق کہہ رہا تھا۔ میں نے پوچھا۔

"تم یہاں سے کام چھوڑ دوگے .... کہاں جاؤگے ماتادین؟"

"چھاونی میں مالک! . . . . وہاں ڈنڈی دار کے پاس ملازم ہو جاؤنگا ——— ڈنڈی دار تمہاری طرح مہربان ہے"۔

پھر ماتادین نے بتایا کہ بیرکس اور بٹلر کی موت سے پہلے

جب کہ لاٹ صاحب کا دفتر بن رہا تھا۔ وہاں ماتا دین اور من بھری کام کر رہے تھے ڈنڈی دار اُدھر آنکلا۔ دھوپ میں بیٹھی ہوئی من بھری کو دیکھ کر ماتا دین سے بولا " اس بچاری کو کیوں تکلیف دیتے ہو، میرے ساتھ چھاؤنی چلو، اسٹور میں بہت سے قلی چاہئیں۔ تمہیں رکھ لیں گے۔ پیسے اچھے مل جائیں گے "

پھر اپنی بات کو جاری رکھتے ہوئے بولا۔

" اس نے کھوراک دینے کا بھی وعدہ کیا مالک . . . . اسٹور میں کام کرنے والے ڈنڈی دار آنکھ بچا کر وہاں سے بہت کچھ اڑا سکتے ہیں میس (MESS) میں سے پنیر، انڈے وغیرہ بھی لے سکتے ہیں۔ کم از کم راشن میں سے تو کچھ نہ کچھ اُن کے پلے پڑ ہی جاتا ہے "

میں نے سوچا، شاید ماتا دین کو وہاں سے حیاتین ج بھی مل سکیں اور اس کی سکھ ودی بھی دور ہو جائے میس میں کا ہو۔ گوبھی، کرم کلا، شلجم، رام ترئی سبھی کچھ تو آتا ہے۔

ایک محنتی مزدور کو کھو دینے پر ضرور رنج ہوتا ہے۔ مگر میں نہیں چاہتا تھا کہ ماتا دین کو کسی صورت بھی اسکے ارادہ سے باز رکھوں، کون جانے من بھری کی بیری بیری کا علاج ہو جائے اور پھر وہ بھی سُنگربھی ہو جائے۔

چند دنوں بعد میں عرفانی کا معتبر ملازم ہو گیا۔

ایک پرانے قبرستان میں ہمارے بزرگوں کی ہڈیوں اور ایک مسماسی گڑھی کے کھنڈروں میں سے ایک سرکاری عمارت آہستہ آہستہ ابھرنے لگی۔ میرے ہاتھ میں وہی پرانا ٹیپ تھا۔ بسا اوقات مجھے بنیادوں کے اندر گھس کر کھدائی کی پیمائش کرنی ہوتی۔ اور کبھی کندہ کاروں اور سنگتراشوں کے کام کا جائزہ لینا ہوتا۔

عرفانی نے تمام بچوں والی عورتوں کو کام سے علیحدہ کر دیا تھا۔ جو عورتیں ملازم رکھی گئی تھیں۔ وہ پیسے کم لیکر مردوں کے برابر کام کرتی تھیں،

جب سرکاری تعمیر کی چھت پر لنٹل ڈالنا پڑا۔ تو چند ایک مزید مزدوروں کی ضرورت لاحق ہوئی، یہ کام عرفانی نے میرے سپرد کیا۔ مجھے چند محنتی اور ایماندار مزدوروں کی ضرورت تھی، میں نے جمعدار رام ادتا رسے ماتا دین کا پتہ پوچھا۔ کانے جمعدار نے مشکوک نگاہوں یا نگاہ سے میری طرف دیکھا اور پھر ہنستے ہوئے ماتا دین کا پتہ بتا دیا۔ اور میں اس کی تلاش میں چھاؤنی جا پہنچا۔

شام کا وقت تھا۔ صدر بازار کی بجلیاں ابھی روشن نہ ہوئی تھیں، ایک گہرا دھواں مزدوروں کی گنجان بستی لال کرتی اور فالور لائینز پر چھایا ہوا تھا۔ اور وقت سے پہلے تیرگی پیدا کر رہا تھا۔ بڑی دقت کے بعد

مجھے ماتا دین کی جھونپڑی ملی۔ ایک بیٹھے ہوئے چھپر کے دروازے پر ٹاٹ
کا پردہ پڑا تھا۔ اور جھونپڑی میں ماتا دین گڑگڑی سلگا کر تمباکو پی رہا
تھا۔ ایک خاص قسم کی بو سب طرف پھیلی ہوئی تھی، ماتا دین کے قریب ایک
رکابی میں کوڑی بھر مکھن پڑا تھا۔ ایلومینم کی ایک تھالی میں ایک بڑا سا گوبھی
کا پھول رکھا تھا۔ اور پھول میں سے ایک سنڈی کچھ چپ چپا لسلسا سا لعاب
اپنے پیچھے چھوڑتی ہوئی تھالی کے کنارے کنارے رینگ رہی تھی۔

ایک جیانتن ج سے ہی مسکراہٹ ماتا دین کے ٹیڑھے میڑھے دانتوں
اور پھولے ہوئے مسوڑھوں کو دکھانے لگی۔ عین اُس وقت جھونپڑی کے اندر
سے کراہنے کی آواز آئی۔

میں نے جھونپڑی کے اندر ایک تاریک سے کمرے میں جھانکا۔ اس
کمرے میں من بھری پڑی تھی۔ وہاں ہوا اور روشنی کی پہنچ نہ تھی، میں نے کہا
مہربان ڈنڈی وار کی مہربانی سے من بھری کو خوراک تو اچھی مل جاتی ہے۔
ممکن ہے اسے بیری پیری سے نجات حاصل ہو جائے تو بھی اس قسم کی فضا
میں ضرور وہ کسی اور خوفناک بیماری کا شکار ہو جائے گی۔ دنیا میں خوراک
ہی سب کچھ نہیں روشنی بھی تو ہے۔ کھلی ہوا ہے . . . . اور دق ہے!
یک لخت روشنی سے اندھیرے میں چلے جانے پر مجھے کچھ دکھائی نہ
دیا، پھر آہستہ آہستہ من بھری کا سہما ہوا چہرہ اور مسلوب جسم نظر آنے لگا، اپنے

کتابی اور سنگِ یشب کی طرح زرد چہرے کے ساتھ من بھری ہو بہو اس مصری لاش کی مانند دکھائی دیتی تھی جس پر ابھی ابھی حنوطی عمل کیا گیا ہو اور جسے نسلوں تک محفوظ رکھے جانے کے لئے ممی میں اتارا جانا ہو۔

ماتا دین نے گڑگڑی کا ایک لمبا کش لگایا، اور برتن میں سے ٹنڈی نکال کر باہر پھینک دی۔ گوبھی کو چیرا، اور معالحہ بھونتے ہوئے اُسے تسلے میں ڈال دیا۔ اس نے بتایا کہ اس کی جورو کے بیمار ہونے کی وجہ سے ڈنڈی دار اُسے بہت کم کام دیتا ہے۔ تمام قلی افسروں کی ٹھوکریں کھاتے ہیں مگر اسے افسروں کے نزدیک جانے کا کام ہی نہیں دیا جاتا۔ اسٹور کیپر، ڈنڈی دار کا سگا ماموں ہے۔ راشن میں سے سب کچھ مل جاتا ہے۔ آخر ڈنڈی دار کتنا اچھا آدمی ہے، ایسے چند آدمیوں کے سہارے ہی تو دنیا جیتی ہے۔

پھر میرے قریب آتے ہوئے ماتا دین بولا۔" ایک کھُسی کی کھبر سناؤں مالک؟"

——اور پھر میرے کان کے قریب منہ کر کے بولا" وہ امید سے ہے۔"

ماتا دین کے بیان کے مطابق ساڑھے تیرہ برس بیاہ کو آئے تھے، اور اس وقت تک اولاد کی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی۔ میری دانست میں تو یہ ماتا دین کی خوش قسمتی تھی۔ غریب طبقہ کے لوگ عموماً کثرتِ اولاد سے نالاں ہوتے ہیں، ان کے لئے تو ایک بچہ بھی بوجھ ہو سکتا ہے۔ مگر ماتا دین خوش تھا

میں نے سوچا شاید من بھری پہلے سے بھی زیادہ بیمار ہو جائے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ بچے کی پیدائش کے بعد اس کی کچھ بیماریاں قدرتی طور پر دور ہو جائیں۔ بہرصورت من بھری کے عرصہ تک بیمار رہنے یا زچگی میں مانا دین کو اکیلے ہی گھر کا جُوا اٹھانا پڑے گا۔ علاوہ اس کے اسکا خرچ بھی دوگنا ہو جائے گا۔

مانا دین کی اس عجیب و غریب زندگی میں کھو کر میں اپنے کام کو بھی بھول گیا۔ میں نے کہا ڈنڈی دار کی مہربانی سے ان لوگوں کو حیاتین 'ب' اور 'ج' دونوں مِل جاتے ہیں، ان کی خوشی —— بچے کی اُمید بھی شاید حیاتین ب کا کرشمہ ہے۔ اور بچے کو بھی اس کے مقدر کا سب کچھ مل جائے گا۔ اب وہ عرفانی کی مزدوری نہیں کرے گا۔ اُسے پرواہی کیا ہے۔ میں نے اس کے سامنے مزدوروں کا تذکرہ ہی نہ کیا۔ گویا میں اُسے یونہی دیکھنے آیا تھا۔

عرفانی کا مال و اسباب شہر میں لے جانے کے لئے چھکڑوں میں سے دو ایک بیل زخمی تھے، پھر بھی ان سے برابر کام لیا جا رہا تھا۔ انجمن تحفظ جانوراں کے ایک افسر نے گاڑی بانوں کا چالان کر دیا۔ اس قضیہ کو نپٹانے کا کام بھی میرے سپرد کیا گیا، اور میں انجمن کے ایک افسر کو رشوت دینے میں مصروف تھا۔

ایک طرف سے ماتا دین ہانپتا ہوا آنکلا، وہ بمشکل پہچانا جاتا تھا اس چند ماہ کے عرصہ میں اس کی شکل یکسر تبدیل ہو گئی تھی۔ اسکے دانت زیادہ گھناؤنے ہو گئے تھے۔ اور اپنے سامنے کھڑے ہوئے آدمی کا چہرہ اچھی طرح دیکھنے کے لیئے وہ بار بار آنکھیں جھپکاتا تھا۔ پہلے تو وہ چند لمحات مجھے غور سے دیکھتا رہا۔ پھر میری آواز کو پہچان کر بولا۔

"مالک! . . . . رام اوتار کے کہنے پر یہاں آیا ہوں، وہ کہتا تھا۔ آپ کو مجوری چاہیئے، میرا چھوٹا بھائی آپکے پاس کام کر ہی رہا ہے۔ مجھے بھی رکھ لو۔"

میں اپنی جگہ پر سے اچھل پڑا۔ بھلا دو ٹکیوں میں کام کیئے جانیوالے ماتا دین کو کون مزدور نہ رکھے گا۔ لیکن میں نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"کیا ڈنڈی دار کا راشن ختم ہو گیا ہے؟"

ماتا دین کچھ نہ بولا۔

"کیا تمہیں خوراک نہیں ملتی اب؟" میں نے دوسرا سوال کیا۔

ماتا دین آنکھیں جھپکتا ہوا انجمن تحفظِ جانوراں کے افسر کی طرف دیکھنے لگا، وہ افسر جان گیا کہ یہ مزدور کچھ کہنا چاہتا ہے۔ مگر اسکی موجودگی نہیں چاہتا۔ وہ خود بخود وہاں سے ہٹ گیا اور ایک کچی دیوار کے

ساتھ ساتھ ٹہلنے لگا۔ ماتادین بولا۔

کیا کہوں مالک! . . . . . ڈنڈی وار نے تو ہماری جندگی برباد کر دی کسی کی سکل سے کوئی کیا جانے۔ بڑا مد ماس تھا جب مجھے کام کرتے ہوئے چند روز ہو گئے تو کہنے لگا قلیوں نے اسٹور کیپر کو شکایت کر دی ہے پھر بھی میں تمہیں تکلیف نہیں ہونے دونگا تمہیں سب کچھ گھر پہنچا دیا کروں گا۔ دو تین دفعہ گھر پہنچا۔ تو وہ مجھ سے پہلے وہاں موجود تھا۔"

"اور من بھری کہاں تھی؟" میں نے دم روکتے ہوئے کہا۔

"وہ بھی اندر تھی . . . . سیدھی سادھی عورت . . . . جھانسے میں آگئی، سرکار ہم اجت والے آدمی ہیں۔ جب میں نے کھری کھری سنائیں تو ڈنڈیدار نے کھوراک دینی بند کر دی۔ اور دوسروں سے ننگنا کام لینے لگا۔ اپھسر جھڑکنے لگے۔ قلی تنگ کرنے لگے۔ میں نے اس کی مجوری چھوڑ دی اور گودام میں کام کرتا رہا۔"

پھر ماتادین نے اپنا شانہ برہنہ کیا۔ اس پر ایک بڑے سے زخم میں چربی دکھائی دے رہی تھی۔ ماتادین نے اپنی بات کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "یہ بعد میں میس کی بوریاں اٹھانے سے ہوا . . . . . میری جان ہی تو نکل جاتی، اگر میں وہاں سے ملاجمت نہ چھوڑتا . . . . میں نے بدنامی بھی سہی مالک . . . . . . لوگ طرح طرح کی باتیں بناتے ہیں۔"

انجمن تحفظ جانوراں کا انسپکٹر قریب آچکا تھا میں نے پانچ کا ایک نوٹ اسکی مٹھی میں دیا۔ وہ بہت خوش ہوا۔ تمام کام ٹھیک ٹھاک کر دینے کا وعدہ دیا۔ اسوقت مجھے من بھری کے ہونہار بچے اور اسکے مستقبل کے سوا اور کچھ نہ سوجھتا تھا۔ ماتا دین کا برہنہ شانہ اب بھی میرے سامنے تھا۔ میں نے انجمن تحفظ جانوراں کے انسپکٹر کو ماتا دین کا شانہ دکھاتے ہوئے پوچھا "کیا آپکا محکمہ ایسے ظلم کا انسداد نہیں کرتا؟" انسپکٹر صاحب نے جیب میں پانچ کا نوٹ ٹٹولتے اور اپنے پالش کئے ہوئے بوٹوں پر چھڑی مارتے ہوئے کہا "چودھری صاحب قبلہ.... وہ تو صرف جانوروں کیلئے ہے —— اور میں نے ماتا دین کو مزدور رکھ لیا۔

سڑکوں اور عمارتوں کے چیف انجینئر نے عرفانی کی بنائی ہوئی ایجرٹن روڈ ناقص قرار دی چیف انجینئر کے ساتھ رشوت نہ چل سکی اور ایک دفعہ پھر ایجرٹن روڈ پر روڈ اپ کے بورڈ رکھ دیئے گئے۔

پھر نرسری میں چند ایک چھوکرے سڑک پر سے کنکر اٹھا اٹھا کر اور انہیں ہوا میں چھوڑتے ہوئے دکھائی دینے لگے، وہ گوپھیے کو چھوڑتے ہوئے اونچی آواز سے اللہ اکبر پکارتے سنائی دیتے تھے —— ماتا دین کا چھوٹا بھائی منیسر کام کرنے کے بعد وہ ایک کولتار کے خالی ٹینوں کے پیچھے پڑ کر ستانے لگا۔ روڈ اپ کو پھلانگتے ہوئے میں اسکے پاس پہنچا میں نے چلاتے ہوئے کہا "ہے .. منیسر"

منیسر گھبرا کر بولا۔ "مالک!"

"ہاں . . . مالک!" میں نے کہا۔ "سنتا ہے تھے نا؟ اور ماتادین کہاں ہے؟ اس کی چار دن سے غیر حاضری لگ رہی ہے۔"

منیسر نے دبی آواز سے کہا . . . "ماتادین حوالات میں ہے سرکار۔"

— میں اپنی جگہ پر سے اچھل پڑا۔ "حوالات میں؟"

منیسر نے بتایا کہ ماتادین نے ایک ڈاکٹر کے ہاں چوری کی اور بھاوج کو ایک سفید دوائی پلائی۔ بعد میں پکڑا گیا۔ پولیس آئی تو ڈبہ گھر میں ملا، بھاوج اس میں سے آدھی دوائی کھا چکی تھی — میں سب کچھ سمجھ گیا۔ میں نے گھوم کر کام کرتی ہوئی عورتوں کی طرف دیکھا، مجھے وہ سب کی سب بیمار دکھائی دینے لگیں، گویا انہیں بڑے بڑے ورم ہو رہے ہوں۔ میرے تصور میں من بھری کا سنگِ تشب کی طرح زرد چہرہ ظاہر ہو گیا۔ مجھے ماتادین سے بہت دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ میں حوالات میں گیا۔ تو دیکھا کہ ماتادین مسکرا رہا تھا۔ اور اس کی مسکراہٹ مستعار نہ تھی۔ اُسے اپنی قید کی رتی بھر بھی پروا نہ تھی۔ وہ خوش تھا کہ اسکے ورم درست ہو جائیں گے۔ وہ خوش تھا کہ منیسر کے ہاں وہ آرام سے رہ کر ایک تندرست بچہ کو جنم دے گی — مگر ماتادین کیا جانے کہ شدتِ غم سے من بھری کا حمل گر چکا ہے۔ وہ منیسر کے بازوؤں میں زندگی کے آخری سانس لے رہی ہے، اور خون سے منیسر کی جھونپڑی کی تمام زمین شنگرفی ہو رہی ہے ۔

لچھمن

لچھمن

لچھمن نے کنوئیں میں سے پانی کی سترھویں گاگر نکالی۔ اس دفعہ پانی سے بھری ہوئی گاگر کو اٹھاتے ہوئے اُسکے دانتوں سے بے نیاز جبڑے آپس میں جم گئے۔ جسم پر پسینہ چھوٹ گیا۔ اُس نے داہنے ہاتھ سے نندو کی بہو ـــــ گوری کی گاگر کو تھاما۔ اور چرخی پر اڑی ہوئی رسی کو دوسرے ہاتھ سے اتارا۔ ایک دفعہ چوکسی اور بیم ورجا سے تیس فٹ گہرے کنوئیں میں جھانکا۔ اپنے شانوں کو جھٹکا دیا۔ جبڑوں کو دبایا تو گال کچھ پھول سے گئے۔ لچھمن نے پھر غور سے اپنے بائیں ہاتھ کی ہتھیلی کو دیکھا۔ ہتھیلی میں سے ٹیسیں اُٹھ رہی تھیں۔ اُنگلیوں کے نیچے آج کچھ نئے نئے، سُرخ سے نشان بن رہے تھے۔ وہ جانتا تھا۔ کہ وہ نشان آج دوپہر تک اُبھرتے ہوئے ایذا رساں آبلے بن جائیں گے۔ اور شرادھ کی کھیر کھانے کے لئے اُس کی انگلیاں یکجا نہ ہو سکیں گی۔ تاہم نصرت کی ایک ہلکی سی سُرخی اُسکے چہرہ پر پھیل گئی۔ اُس نے کاٹھ گودام کی اُن بہو بیٹیوں کی طرف دیکھا اور ہانپتے ہوئے بولا۔

"رام کالی . . . آج شرادھ ہے کس کا؟"

نند و کی بہو آگے بڑھی ۔ اس نے ایک ہاتھ سے گھونگٹ کو چوٹی کی طرف کھسکایا ۔ کولہے پر سے دھوتی کا پلہ سرک گیا ۔ اس نے احتیاط سے ایک پلہ سینہ پر ڈالا اور لجاتی ہوئی بولی ۔ "میرے باوا کا . . . . اور کس کا ہوگا ؟"

—— اور پھر سب عورتیں لچھمن کی تعریف کرنے لگیں —— "بہت بہادر آدمی ہے لچھمن ۔ راٹھور ہے نا ، دوسری بولی ۔ لچھمن کا بیاہ ہوگا میں اس کی گھوڑی گاؤں گی ۔ گھوڑی کی باگ تھاموں گی ۔ جوڑا گاؤں میں اسکی ماں کے میکے ہیں ۔ میری ماں کے میکے بھی جوڑا گاؤں میں تھے ۔ میں لچھمن کی بہن ہوئی نا ۔ اور ایک کہنے لگی ۔" مجھے تو بھاوج کا رشتہ ہی پسند ہے ۔ میں اس کی آنکھوں میں سلائی ڈالوں گی ۔ میری گاگر بھری تو کیا احسان کیا ؟ دیور بھابیوں کے سینکڑوں کام کرتے ہیں ۔ گوری بہو ! چڑھے پوہ کوئی ساہا نکلے ۔ گلابی سی سردی ہو ۔ بڑا مزا رہے گا ۔ اس سال نہ بھی ہو تو جلدی کا ہے کی ہے ۔ لچھمن بھائی کوئی بوڑھا ٹھوڑے ہی ہو گیا ہے . . . . "

—— اور لچھمن کی عمر پچپن برس کی تھی ۔ سترھویں گاگر نکال چکنے کے بعد اُس نے اپنے پھولتے ہوئے بازوؤں کی طرف دیکھا ۔ اور پھر کنکھیوں سے نند و کی بہو گوری کی طرف . . . کاٹھ گودام کے سب

آدمیوں نے گوری کے حسن کی تعریف تو سُنی تھی۔ مگر لچھمن کے سوا کبھی اسے جی بھر کر کسی نے نہ دیکھا تھا۔ اس کو دیکھ کر لچھمن کو یاد نہ رہا۔ کہ اس کے ہاتھوں پر انہی بڑی بڑی مست نیم وا آنکھوں نے کوئلے سے دھرے دیے ہیں۔ اور وہ عورت جس کے جوڑا گاؤں نہال تھے۔ اس کی ماں کو جب لچھمن کے باپ نے سالی کہا تھا۔ تو اچھا خاصا کوروکشیتر چھڑ گیا تھا۔ اور اسی کنوئیں پر جب اس نے ایک دفعہ بھابی کا آنچل تھاما۔ تو بھائی نے اس کی ناک توڑ دی تھی . . . . دفعتاً لچھمن نے اپنے آپ کو ایک بڑی سی آنکھ بنتے دیکھا۔ جس میں گورے گورے بازو جھنکارتے ہوئے پازیب سرکتے ہوئے پلے اور نہ جانے کیا کچھ سما گیا۔ اُسے یوں محسوس ہوا جیسے یکے بعد دیگرے تین بوجھل سے غلاف آہستہ آہستہ اُس کے جسم پر سے اُتر گئے ہوں۔ وہ اپنے آپ کو پچیس برس کا نوجوان سمجھنے لگا۔

لچھمن نے سوچا۔ اول تو عورتیں بہادری کو پسند کرتی ہیں۔ کیونکہ ان میں اس مادہ کا فقدان ہوتا ہے۔ اور دوسرے وہ اس مرد کی طرف مائل ہوتی ہیں۔ جو عورت کے سامنے مرد کی فطری کمزوری کو ظاہر نہ ہونے دے۔ دوسرے لفظوں میں محبت میں بس کر بھی اظہارِ تعشق نہ ہو۔ کیونکہ دوسری طرح بات کچھ عام سی ہو جاتی ہے۔ آج کنوئیں پر چھوٹی بڑی اس کی بہادری کا سکہ مان گئیں۔ آج تو وہ بالکل مشبد سروپ ہو گیا تھا

تبھی تو سب 'رادھائیں' اس کی طرف کھچی چلی آتی تھیں۔ مگر اُس نے کمزور کم ظرف آدمی کی طرح ان کی طرف ضرورت سے زیادہ متوجہ ہو کر اپنے مردانہ وقار کو کم نہیں کیا اور ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ستّرہ گاگریں ؟ سمر سنگھ کی جان نکل جائے، گوری تو ضرور اُٹھتی بیٹھتی یہی سوچتی ہوگی۔ کہ میرا شوہر لچھمن کے مقابلہ میں کس قدر نالائق اور کمزور ہے ۔ ۔ ۔ کاش میں لچھمن کی بیوی ہوتی ! اگرچہ آج ان عورتوں میں سے ایک خود بخود بہن اور دوسری بھاوج بن گئی ہے۔ اس وقت لچھمن پل بھر کے لئے بھی یہ نہ سوچ سکا، کورو کھشیتر کس طرح بپا ہوا تھا۔ اور اس کی ناک کیوں توڑی گئی۔ لچھمن نے نہ جانا کہ وہ کھو کھلے سے آواز صرف گاگریں نکالنے کی قیمت ہیں۔ اگر گھونگٹ کو ذرا سا چُٹیا کی طرف سرکا دینے سے شرادھ کے لئے سارا پانی مل جاتا ہے۔ تو کسی کا بگڑتا ہی کیا ہے عورتیں اپنی آنکھوں کی ہیرا پھیری سے سینکڑوں کام سِدھ کر لیتی ہیں حقیقت تو یہ ہے کہ سترہ گاگریں تو اکیلی گوری کے حُسن کی جھلک کی قیمت ہے۔ اور محض ادنیٰ اسی قیمت ۔ ۔ ۔ اور وہ مست آنکھیں ! ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وگرنہ کون بھابی ہے۔ اور کون دیور ؟ گوری بھی ایک مایا ہے اور مایا ہی رہے گی !

× × × × × × ×

کاٹھ گودام کے سبھی لوگ جانتے تھے کہ لچھمن کو بابا کے نام سے

پکارنا کتنا خطرناک کام ہے۔ لچھمن بری سے بری گالی برداشت کرنے کی قوت رکھتا تھا۔ مگر بابا کا لفظ اُس کے دماغی توازن کو مختل کر دیتا۔ بابا کے جواب میں تو بابا، تیری ماں بابا، تیرا بابا بابا اور اس قسم کی ہذیان بکتا اور بڑے بڑے پتھر پھینکتا۔ وہ ابھی اپنے آپ کو چھوکرا کیوں سمجھتا تھا؟ اسے کھٹکا سا لگا ہوا تھا کہ اگر وہ بوڑھا ہو گیا تو کون اسے اپنی لڑکی کا رشتہ دینے چلے گا۔ چھوٹے چھوٹے لڑکے بابا لچھمن ۔۔۔ بابا لچھمن کہہ کر تماشا دیکھتے۔ مگر وہ اپنے تجربہ کی خوفناک نوعیت سے واقف تھے۔ زور سے بابا کہہ چکنے کے بعد وہ کاٹھ گودام منڈی کی بوریوں کے پیچھے یا اس کی تنگ گلیوں میں غائب ہو جاتے۔

جب کوئی کہتا کہ مالک رام کے بیاہ کی تاریخ ۱۵ پھاگن مقرر ہوئی ہے۔ تو لچھمن ایک اضطراب کے عالم میں سن باٹنی چھوڑ دیتا۔ اپنی لاٹھی کو اُٹھا کر زور سے زمین پر ٹپکتا۔ اور کہتا۔

"ہاں بھائی! ۔۔۔ ۱۵ پھاگن"

دوسرا کہتا۔ "ہاں بھائی ۔۔۔ ہم نہ بیاہے تو کیسے ساہے؟"

لیکن لوگ اُسے خوش کرنا بھی جانتے تھے۔ کوئی کہتا لچھمن، آج تو تیرے چہرے پر سولہ برس کے جوان کا روپ ہے۔ ارے بھائی! رڈھیا کی چھوکری جوان ہو رہی ہے۔ ایسی ہی جوان ہے۔ جیسے تم ہو۔ خوب

میل ہے، بڑا جوڑ ہے۔ اگر تم اُسے حاصل کر سکو۔ تو کتنا مزا رہے۔
لچھمن جوانی میں حبس بے جا اور اغوا کی سزائیں کاٹ چکا تھا۔
اس لئے وہ خاموشی سے دو تین بار ردھیا کی بیٹی کا نام لیتا، اور ذہن
میں سینکڑوں بار ـــــ اٹھتے بیٹھتے، کھاتے پیتے، ـــــ ردھیا
کی بیٹی . . . . . . ردھیا کی بیٹی . . . . . . دہرائے جاتا۔ حتے اکہ اس
کی داڑھی میں کھجلی ہونے لگتی۔

کاٹھ گودام ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔ آٹھ نو سو کے لگ بھگ
گھر ہونگے۔ تحصیل سے ایک کچا راستہ کیکر اور شیشم کے تناور درختوں
کے درمیان سانپ کی طرح بل کھاتا ہوا چند میل جا کر ایک بڑے سے
بڑ کے نیچے یک دم رُک جاتا۔ عام طور پر مسافر وہاں پہنچکر ششدر رہ
جاتے۔ انہیں یوں نہیں دکھائی دیتا۔ گویا راستہ اس سے آگے کہیں نہ
جائے گا۔ یعنی باوجود زمین کے گول ہونے کے کاٹھ گودام دنیا کا
ٹرمینس ہے۔ بات دراصل یہ تھی کہ بڑ کی بڑی بڑی داڑھیوں میں سے
ہو کر تین چھوٹی چھوٹی گلیاں گاؤں میں داخل ہو جاتی تھیں۔ چند خستہ
حالت کچے مکانوں، ایک آدھ چھوٹی اینٹ کی عمارت جس میں بورڈ
کا ایک پرائمری اسکول تھا، شاہ رحیم کی قبر اور کالا بھیرو کے مندر کے
گرد گھوم کر تینوں گلیاں پھر گاؤں کے مشرق کی طرف ایک کشادہ

سی سڑک سے مل جاتی تھیں۔ کالا بھیرو کے مندر کے قریب کالے کالے کتے گھومتے رہتے تھے۔ اور ان کی آنکھوں سے غصہ اور دانتوں سے زہریلا لعاب ٹپکتا تھا۔ کالا بھیرو شوجی مہاراج کے اوتار گنے جاتے ہیں۔ اُن کی رفاقت میں ہمیشہ ایک سیاہ فام کتا رہا کرتا تھا۔ اس لئے کالا بھیرو مندر کے پجاری چپڑی ہوئی روٹیوں اور پوریوں وغیرہ سے سیاہ فام کتوں کی خوب تواضع کیا کرتے تھے۔ اس قسم کے کتے بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ اور سرکاری آدمیوں کو اُنہیں رگولی ڈالنے کی مجال نہ تھی۔ کتے مفت کی کھاتے تھے۔ اور موٹے ہوتے جا رہے تھے۔ کاٹھ گودام میں داخل ہونے والے راستہ کے پاس بڑ کے ایک بڑے تنے کے نیچے لچھمن بیٹھا کرتا تھا۔ وہ تین کام کرتا تھا۔ اول تو ہر ناواقف مسافر کو کالا بھیرو والے راستہ سے نہ گزرنے کی ہدایت کر کے کتوں سے بچاتا۔ دوسرے اُسے اپنے کنوئیں کا شیریں اور مصفا پانی پلاتا۔ اور تیسرے زندگی کا گزارا کرنے کے لئے سن کی رسیاں بانٹتا۔

کبھی کبھی کوئی انجان مسافر بڑ کے نیچے لچھمن کو چہرے سے درویش صورت پا کر نہایت تپاک سے پوچھتا "پانی پلاؤ گے بابا؟" تو لچھمن فوراً لاٹھی اُٹھا لیتا اور کہتا۔ "بیٹی کا رشتہ تو نہیں مانگتا جو مجھے بابا سمجھتے ہو اسی کنوئیں سے اس دن سترہ گاگریں پانی کی کھینچی تھیں۔ تمہارے

گاؤں کی سب عورتوں کو اپنے دام میں گرفتار کر سکتا ہوں۔ سمجھتے کیا ہو۔ اس بات کو وشنو عطار جانتا ہے . . . سارا محلہ جانتا ہے، گاؤں جانتا ہے . . . " اور پھر کالا بھیرو کے تمام گُنتے مسافر پہ چھوڑ دیتا اُس بیچارے کی خوب ہی آؤ بھگت ہوتی۔ حتیٰ کہ وشنو عطار یا بازار کا کوئی اور دوکاندار مسافر کو اُس کی غلطی سے آگاہ کر دیتا۔ اور اگر وہ اپنے گاؤں سے اُسکے لئے کسی میگھو، جنک ولاری یا ردھیا کا رشتہ لا دینے کا خیال ظاہر کرتا تو اس کی مٹھی چاپی ہوتی۔ بستر بچھا بچھایا استراحت کے لئے بِل جاتا۔ اور لچھمن پوچھتا ——

"گانجا لاؤں چاچا . . . کالا بھیرو کا گانجا تو دور دور مشہور ہے سبھی لوگ جانتے ہیں۔ تم نہیں جانتے کیا؟"

کبھی کبھی وشنو اور کاٹھ گودام کی چھوٹی سی منڈی کے لوگ دُور سے کسی مسافر کو آتا دیکھتے۔ تو وہ کہتے۔ "لچھمن بھائی، دیکھو وہ کوئی تمہیں دیکھنے کے لئے آ رہا ہے۔ شاید سیتا موہری کا باپ ہے۔ سیتا موھری جوڑا گاؤں کے نمبردار کی لڑکی ہے۔ بہت خوبصورت! ذرا سنور جاؤ۔ ہاں! یوں لچھمن پہلے تو گانجا کا کش لگاتے ہوئے کہتا —— او بھائی . . . لچھمن تو جتی ہے۔ جتی ہونا کتنی اونچی اوستھا ہے . . . . مگر پھر فوراً ہی لچھمن اپنی دھوتی اور پٹکے کے بل درست کرنے لگ جاتا۔ اور عطار کی دوکان پر ہو کر

ٹنگی ہوئی قمیص پہن کر جلدی جلدی اُسکے بٹن بند کر لیتا اور پھر باوجود نہایت ہوشیاری سے کام لینے کے اُس کی داڑھی میں کھجلی ہونے لگتی۔

× × × × × × × ×

وشنو عطار کی وساطت سے لچھمن کو کالا تیل مل گیا تھا۔ کم ازکم لچھمن کو اس دوائی کا نام کالا تیل ہی بتایا گیا تھا۔ اس میں خوبی یہ تھی۔ کہ برف کی طرح سپید داڑھی چند ہی لمحوں میں اُتر سے آنے والی گھٹا کی طرح کالی ہو جاتی تھی۔ لچھمن تو عطار کی حکمت کا سکہ مان گیا تھا۔ یہ وشنو میں ہی طاقت ہے کہ وہ پلک جھپکنے میں پچپن برس کے بڈھے کو بیس برس کا جوان بنا دے۔ لچھمن نے اس کے عوض کتنی ہی سن کی رسیاں بٹ کر وشنو کو سامان وغیرہ باندھنے کے لیئے دی تھیں۔

وشنو کی دوکان پر کبھی گلقند کے لیئے کھانڈ کا قوام پکایا جاتا۔ اور کبھی عرق گاؤزبان نکالا جاتا۔ ہر روز بھٹی جلتی تھی۔ کبھی کبھی بہت سے اپلوں کی آنچ میں کشتے مارے جاتے تھے۔ اور کالے تیل کا غلام بنا ہوا لچھمن وشنو کے سینکڑوں کاموں کے علاوہ بھٹی میں آگ بھی جھونکا کرتا تھا۔

لچھمن تھوڑا بہت پڑھنا جانتا تھا۔ وہ کبھی کبھی حیرت سے وشنو کی دوکان میں رکھے ہوئے ڈبوں پر جلی قلم سے لکھے ہوئے لفظوں کو پڑھتا عقرقرحا۔ معجون سرنجان، خمیرہ ابریشم عناب والا، جوارش آملہ عنبری...

...اس کے علاوہ اور بھی کئی بوتلیں تھیں، کسی میں عرق بر نجاسف تھا اور کسی میں بادیاں۔ ایک طرف چھوٹی چھوٹی شیشیاں پڑی تھیں جن میں کشتہ سنگِ یشب، شنگرف وغیرہ رکھے تھے۔ ان چھوٹی شیشیوں پر لچھمن کی نظریں جمی رہتی تھیں۔

چھٹے شرادھ کے دن لچھمن کو نندو کے ہاں پھر بلایا گیا۔ لچھمن نے کالا نیل ملا اور نندو کے ہاں جانے کی تیاری کرنے لگا۔ اُس کی آنکھوں میں گوری کی تصویر بجلی کی طرح کوند کوند جاتی تھی۔ اگرچہ اسکے ہاتھوں پر ابھی تک آبلے دھکتے ہوئے کوئلوں کی طرح پڑے ہوئے دکھائی دیتے تھے مگر گوری کی موہنی مورت اُس کے کلیجہ میں ٹھنڈک پیدا کر رہی تھی۔

لچھمن نے ریشمی پٹکا باندھا۔ یہ اسے کالا بھیرو کے ایک پروہت نے دیا تھا، پروہت جی کے جسم پر آبلے پھوٹ جانے پر لچھمن نے اُن کی بڑی سیوا کی تھی، جیٹھ، ہاڑ اور ساون تین مہینے سردائی، ٹھنڈائی وغیرہ رگڑ کر پلائی تھی۔ پروہت کو وہ پٹکا ان کی کسی معتقد عورت نے دیا تھا۔ پروہت کے ارد گرد عورتوں کا تانتا لگا رہتا تھا۔ اور عورتیں انہیں تھالیوں میں سیدھا اور نہ جانے کیا کیا کچھ بھینٹ کرتیں۔ عقیدت ہی تو ہے۔

لچھمن نے پٹکا باندھا اور عزیز رسے وشنو کی دکان کے شیشے میں اپنی پگڑی کو دیکھا۔ الماری میں لگے ہوئے شیشوں میں اسے اپنی شکل

اور چند ایک گدھے دکھائی دیئے۔ گدھے اس کی پیٹھ کی جانب کمہار کے برتنوں سے لدے جا رہے تھے۔ کاٹھ گودام کے تمام برتن پک کر تحصیل میں بکتے تھے۔ اور وہ گدھے تحصیل ہی کو جا رہے تھے۔ عطار کی الماری کے شیشے میں لچھمن کو اپنا عکس بہت ہی دھندلا سا نظر آتا تھا۔ مگر اس کے باوجود لچھمن جانتا تھا کہ یہ اس کا اپنا عکس ہے۔ اور وہ قریب زکھڑے ہوئے گدھے کا........ وشنو نے لچھمن کی امتیاز کر لینے کی قوت کی جی کھول کر داد دی۔

لچھمن نے گوری کے گھر جانے کے لئے قدم اٹھایا تو اسکا دِل دھک دھک کرنے لگا۔ اُسے یوں محسوس ہوا جیسے اُس کے سارے جسم پر کوئلے ہی کوئلے دھر دیئے گئے ہوں۔ کچھ دیر کے لئے ہاتھ کی جلن تو ختم ہو گئی۔ کیونکہ اس کا سارا جسم ہی ایک بڑا سا ہاتھ بن گیا تھا۔ لچھمن اٹھا۔ لڑکھڑایا، لیٹ گیا۔ چند لمحات کے بعد اس نے آنکھیں کھولیں اُسے یوں محسوس ہوا۔ جیسے اُسکے کنوئیں کی منڈیر پر سترہ گاگریں ایک قطار میں رکھی ہوں۔ اس نے آنکھوں کو ملا۔ دوکان کے اندر لگے ہوئے جالوں، بھڑ کے دو تین چھتوں اور ایک آرام سے لٹکتی ہوئی چمگادڑ کو دیکھا۔ اور پھر آنکھیں بند کر کے ہوا کو ایک چھوٹی سی گالی دی۔ کیونکہ وہ اس کے ٹیچے سے چھیڑ چھاڑ کر رہی تھی۔

گدھوں پر مزید بوجھ لادا جا رہا تھا۔ کمہار نے چھ ماہ کے عرصہ میں چار پانچ سو برتن، حقے کی چلمیں، راہٹوں کی ٹینڈیں بنا رکھی تھیں، پہیہ اور پاؤں دن رات چلتے رہتے تھے۔ اور کمہار کے جھونپڑے سے گنگنانے کھنکارنے، تھوکنے، حقے کی گڑگڑاہٹ اور تھپ تھپ کی آوازیں پیہم سنائی دیتی تھیں۔ گدھے تو بوجھ محسوس ہی نہیں کرتے تھے۔ گویا سارے کا سارا کاٹھ گودام اٹھالیں گے۔ لچھمن نے دل میں کہا۔ یقیناً یہ گدھے مجھ سے زیادہ بوجھ اٹھا سکتے ہیں ...... اگرچہ سترہ گاگریں ......

اس وقت کمہار نے آواز دی۔ "او گدھے کے بچے!"

لچھمن نے کہا۔ آخر وہ گدھے ہیں۔ اور میں آدمی ہوں۔ اگر یہ بات او بچے ہی جاتی تو شاید وشنو ایک دفعہ پھر اس کی امتیاز کرنے والی غیر معمولی قوت کی داد دیتا — بازار میں ایک لڑکا جسے کالی کھانسی کی شکایت تھی۔ بڑے مزے سے کھڑا پکوڑے کھا رہا تھا اور کھانسے جاتا تھا۔ اس کے پاس ہی ایک نسبتاً چھوٹا لڑکا قمیص کا کف منہ میں ڈال کر چوس رہا تھا۔ کئی چھوکرے تحقیل سے منگوائی برف کے گولوں پر لال لال شربت ڈلوا کر انہیں چاٹ رہے تھے۔ گلی میں چند عورتیں باتیں کر رہی تھیں۔ ایک کہتی تھی جب میرا چندو

پیدا ہوا تو اُسی دن ہماری گائے نے بچھڑا دیا۔ اور دشنو پکوڑے والے سے پوچھ رہا تھا۔ کیوں بھائی! اس دفعہ اردھ کُمبھی پر نہ جاؤگے؟" چھوکروں نے لچھمن کو دیکھا تو اس کا حلیہ عجیب ہی بنا ہؤا تھا۔ ان کا لڑکپن کاگ کی طرح تیر کر سطح پر آگیا۔ لڑکے چلّائے۔ "بابا لچھمن . . . بابا لچھمن!" لچھمن بوکھلا کر اٹھا۔ چھت پر جمگادڑ چکر لگانے لگی۔ دو تین بھڑیں بھنبھنانے لگیں۔ چارپائی کے پائے سے لچھمن کا گھٹنا ٹکرایا۔ لچھمن کو ایک بڑا سا چکر آیا۔ اس نے ہوا کو ایک گالی دی اچھینکا اور رونے لگا۔

× × × × × ×

گوری عرصہ تک نئے لچھمن کو دیکھ کر ہنستی رہی۔ اسے ایسے دکھائی دے رہا تھا۔ جیسے وہ لچھمن کے عجیب سے روپ کو دیکھ کر شرادھ تو کیا اپنے پتروں کو بھی بھُول گئی ہے۔ بھیرو استھان کے پروہت بھی آئے ہوئے تھے۔ جب گوری ان کی تواضع کرتی تو لچھمن کے دل میں خلش سی محسوس ہوتی۔ پھر وہ اپنی کم ظرفی پر اپنے آپ ہی کو کوستا۔ جب پروہت چلا گیا تو گوری نے گھونگٹ چیٹیا کی طرح سرکا دیا۔ عورتیں بچوں ہجڑوں اور بوڑھوں سے پردہ اُٹھا دیتی ہیں اور اُس نے لچھمن سے پردہ اُٹھا دیا تھا۔ لچھمن نے مشکوک نگاہوں سے گوری کو دیکھا۔ دل میں فیصلہ کیا کہ محبت بھی تو کسی کو بے پردہ بنا دیتی ہے۔ گوری نزدیک آئی تو لچھمن نے

یوں محسوس کیا۔ جیسے اس کے وجود کا اسے قطعی علم نہیں۔ اور جوں جوں وہ بے اعتنائی ظاہر کرتا۔ گوری کھچی چلی آتی تھی۔ لیکن پھر سوچا کہ یہ سب کچھ کھچاؤ کالے تیل کی وجہ سے تھا۔

روٹی سے فارغ ہونے پر محلہ بھر کی عورتیں لچھمن کے گرد ہو گئیں۔ گوری ان سب کی ترجمانی کرتی تھی۔ بولی "سترہ گاگریں! . . . . بہن ہیں تو مان گئی لچھمن کو . . . . . اپنے مرد تو بالکل کسی کام کے نہیں دو گاگریں اتنے گہرے کنوئیں سے نہ نکال سکیں لچھمن راٹھور ہے۔ آدمی تھوڑے ہے . . . . ان کے بڑوں نے ہماری تمہاری لاج رکھی تھی۔ اب کل کی ہی تو بات ہے۔ کتنے آن والے آدمی تھے راٹھور!"

لچھمن کا منہ کان تک سُرخ ہو گیا۔ اس نے اپنی خوشی کو چھپانے کی کوشش کی۔ مگر ناکامیاب رہا۔ وہ عورت جسکے جوڑا گاؤں ننہال تھے اور جس سے 'گاگر کی بہن' کا رشتہ تھا۔ بولی "میں تو بھابی کے آنے پر خوب رنگ رلیاں مچاؤں گی۔ ناچوں گی . . . گاؤں گی . . . . سگری رین موہے سنگ جاگا۔ بھور بھئی تو بچھڑن لاگا . . . . . . اور بھابی کتنی خوش ہو گی!"

'گاگر کی بھابی' بولی۔ "میں نے تو اپنے لئے دیورانی ڈھونڈھ لی ہے۔" لچھمن کے کان کھڑے ہو گئے۔ جب بھابی نے کہا۔ مجھے تو اس کا

نام بھی معلوم ہے۔ تو لچھمن بہت ہی خوش ہوا۔ ضبط نہ کر سکا۔ بولا۔

"کیا نام ہے بھلا اس کا؟"

"نام بڑا سُندر ہے۔"

"کہو گی بھی؟"

"ذرا مزاج کی سخت ہے۔"

"میں جو نرم ہوں۔"

"گوری بھی جانتی ہے۔"

"کوئی کہے گی بھی؟"

"کاؤدیوی!" گوری نے کہا۔

"کاؤدیوی؟" لچھمن نے پوچھا۔ دو دفعہ نام کو دہرایا اور ذہن میں سینکڑوں بار اس کا جاپ کیا۔ حتّٰی کہ اس کی ڈاڑھی میں کھجلی ہونے لگی۔

گوری بولی۔ "تم اعتبار نہیں کرتے۔ تو میں کالا بھیرو کی سوگند لیتی ہوں۔ کاؤدیوی سے بیاہ کر دانے کا میرا ذمہ۔ سارا خرچ میں اپنی گرہ سے دوں گی۔"

× × × × × × ×

اب لچھمن کے پاؤں زمین پر نہ پڑتے تھے۔ شب و روز نندو کے گھر کا طواف کرنے لگا۔ اُس کے ذرا سے اشارے پر تعمیل چلا جاتا۔

کمہاروں کے گدھوں سے زیادہ بوجھ اُٹھا لیتا۔ کالا بھیرو کے کتوں سے زیادہ شور مچاتا اور کاٹھ گودام کے پنڈتوں سے زیادہ کھاتا۔

اس دفعہ برسات میں گوری کے گھر کا پرنالہ اوپر کی منزل پر بند ہو گیا تھا۔ گوری نے لچھمن کو کہا کہ وہ چھجے پر چڑھ کر پرنالہ تو صاف کر دے۔ لچھمن نے کوٹھے پر چڑھ کر دیکھا تو پرنالے میں ایک کتے کا پلّہ مرا پڑا تھا اور پلّے کا سر پرنالے میں بے طور پھنس گیا تھا۔ اب پلّہ کالے رنگ کا تھا۔ اس کی عزت ملحوظ خاطر تھی۔ مار کاٹ کر نکالنا کالا بھیرو کی بے عزتی کرنا تھا۔ مگر پلّہ نہ اوپر آتا تھا۔ نہ نیچے جاتا تھا۔

لیکن لچھمن اپنے آپ میں ایک نئی جوانی پا رہا تھا۔ اور عنقریب ہی شادی کی خوشی میں اُس نے جوان بننے کے لئے وشنو عطار کی کئی دوائیاں کھائیں۔ آج دوائی زیادہ کھا لینے کی وجہ سے اس کا سر پھٹ رہا تھا۔ اور اُسے تمام جسم میں سے شعلے نکلتے دکھائی دیتے تھے۔ جوش میں وہ سب کام کئے جاتا تھا۔ تقریباً دو گھنٹہ تک وہ سخت دھوپ میں چھجے پر بیٹھا پرنالے کو صاف کرتا رہا۔ نیچے سے چند بچوں اور عورتوں نے آوازیں دیں۔

"بابا۔۔۔۔ بابا۔۔۔ کاؤ دیوی آئی"

لچھمن نے گھبرا کر چاروں طرف دیکھا۔ بچوں کو گالیاں دیں، کتنے

کے پلّے کو دُم سے پکڑ کر زور سے کھینچا۔ تو وہ جھٹکے سے باہر نکل آیا مگر ساتھ ہی لچھمن کو اس زور سے جھٹکا لگا کہ وہ اوپر کی منزل سے زمین پر آ رہا۔

سارے کا سارا کاٹھ گودام نندو کے گھر پل پڑا۔ لوگوں کو لچھمن کے یوں مجروح ہونے کا بہت افسوس تھا۔ خصوصاً جبکہ کاؤ دیوی سے اُس کی شادی کا چرچا چھوٹے بڑے کی زبان پر تھا۔ نرم دل لوگوں نے بے چارے کی مصیبت پر آنسو بھی بہائے۔

شام کے قریب خبر ملی کہ چوٹ ووٹ کی اب کوئی بات نہیں رہی۔ لچھمن شادی کے لئے بالکل تیار ہے۔ آج شام کو اُس کی شادی ہوگی' گاگر کی بھابی، تو کہتی تھی۔" اتنی بھی جلدی کا ہے کی ہے . . . . لچھمن کوئی بوڑھا تھوڑے ہو گیا ہے؟"

شام کو باجا بجنے لگا۔ کاٹھ گودام کے بہت سے آدمی براتی بن کر شادی میں شامل ہوئے۔ لچھمن کو بہت اچھے پہناوے پہنائے گئے۔ سہرے باندھے گئے۔ وہ اور بھی جوان ہو گیا تھا۔ لوگوں نے شمشان میں ایک بڑے پرانے پیپل کے پیڑ

تلے نوجوان لچھمن کو رکھ دیا۔ ایک طرف سے آواز آئی "ہٹ جاؤ ..... دلہن آ رہی ہے"...... ایک آدمی چھکڑا گھسیٹتا ہوا لایا چھکڑے میں سے لکڑیاں اتار کر زمین پر چتا کی صورت میں چُن دی گئیں۔ اوپر لچھمن کو رکھا اور آگ لگا دی .... یہ عجب شادی تھی۔ جس میں سب براتی رو رہے تھے۔ اور جب نند کی بہو گوری نے کاؤ کی ان تمام لکڑیوں کا خرچ اپنی گرہ سے دیا۔ تو اُس کی چیخ ہی نکل گئی ٭

ردِ عمل

جلال کو بالآخر فرصت مل ہی گئی۔ کہ وہ اپنی عیش ونشاط کی محفل کو چھوڑ اور دختِ رز سے رخصت لے کر اپنے مرتے ہوئے چچا کو اُسکی درخواست پر ایک دفعہ دیکھ لے۔

ابھی ابھی تھوڑا سا مینہ پڑا تھا۔ حبیب منزل کے سامنے پانی نشیب میں کھڑا ہو گیا۔ صرف گذرنے کے لئے ایک چھوٹی سی مخدوش پگڈنڈی رہ گئی۔ جلال نے اپنی پتلون کے پائنچوں کو احتیاط سے سنبھالتے ایڑیاں اٹھا اٹھا کر قدم رکھتے اور خاموشی کی زبان میں اس اہم طلب کی وقعت کو غیر ضروری گردانتے ہوئے اپنے چچا کا دروازہ کھٹکھٹایا۔

سکینہ، جلال کی چچا زاد بہن نے دروازہ کھولا۔ اور پھیلتی ہوئی آنکھوں سے جلال کی طرف دیکھا۔ اور آنسو کا وہ قطرہ جو کہ پہلے آنکھ میں اٹکا ہوا تھا۔ اسکے چہرے پر ٹپک پڑا۔ کچھ حیرانی سے اُس نے کہا۔

"جلال، تم آ گئے . . . ابا جان کی امیدوں کے خلاف — وہ تمہیں ابھی ابھی یاد کر رہے تھے۔"

جلال نے بہن کی بات کو عجب بے توجہی سے سُنا۔ برامدے

کے اندر داخل ہوتے ہوئے اُس نے نیم بوسیدہ ٹاٹ سے اپنے بوٹوں کو نہایت اطمینان سے رگڑ رگڑ کر کیچڑ سے پاک کیا۔ ایک عام دنیادار کی مانند جلال نے ظاہری اضطراب کا کوئی نشان چہرے پر ہویدا نہ ہونے دیا۔ نہ اس کی آنکھیں اپنے حلقوں میں گھبراہٹ سے پھیلیں۔ نہ اُس کی رفتار میں خلافِ معمول سرعت آئی۔ چیسٹر کو اتار کر کندھے پر ڈالتے ہوئے وہ برامدے کے دائیں کونے کے دریچے میں جو گلی میں کھلتا تھا۔ کھڑا ہو گیا۔ پھر اس نے ختم ہوتے ہوئے سگریٹ کا ایک لمبا کش لگایا۔ اور اُسے گلی میں پھینک دیا۔ سکینہ جو اپنی والدہ کو جلال کی آمد کی اطلاع دے کر آتی تھی بولی۔

"جلال —— تم ابھی یہیں ہو بھائی؟"

"چچا کس کمرے میں ہیں؟ یہ تو تم نے بتایا ہی نہیں سکینہ۔"

"اس کمرے میں . . . . جس کے سامنے تم کھڑے ہو، جلال، جلدی پہنچو، تمہارے پہنچنے سے شاید اُن کی مضمحل طبیعت کچھ بہل جائے۔"

جلال نے آہستہ سے دروازہ کھولا۔ اندر داخل ہوتے ہی اُس کی نظر ڈاکٹر پر پڑی۔ ڈاکٹر کے ہاتھ میں ایک پرانی سی سٹیتھوسکوپ تھی، دوسرے ہاتھ کی انگلی کو لبوں تک لے جاتے ہوئے اُس نے مطلق خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ جلال ایڑیوں کے بل چلتا ہوا کمرے کے داہنی طرف

ہولیا۔ وہاں سے اسے اپنے چچا حبیب احمد ادیب کا زرد چہرہ صاف طور پر نظر آرہا تھا۔ اس پر تھکاوٹ کے آثار اچھی طرح سے نمایاں تھے اس کا ہر ایک خط جو کسی نتیجہ خیز تجربہ زندگی کی نشانی تھا زیادہ گہرا ہوگیا تھا۔ نقاہت کی وجہ سے اس کی آنکھیں مکمل طور پر بند نہ تھیں بے رونق، نیم وا آنکھوں کے دھندلے پن کو دیکھ کر دل کو ایک وحشت سی محسوس ہوتی تھی۔

"یہ ہے زرد رُو، جھریوں والا، کل انچاس برس کا محنتی بوڑھا۔ جس کی بابت ملک الشعراء نے کہا تھا کہ وہ مکمل آدمی ہے۔" جلال نے دل میں کہا "کتنا بڑا خطاب دیا اس نے۔ مکمل آدمی ہونا کتنا بڑا امتیاز ہے۔ آج کون آدمی صحیح طور پر مکمل کہا جا سکتا ہے۔"

معاً ادیب نے آنکھیں کھولیں اور اپنا منہ دائیں طرف موڑا۔ سامنے جلال کھڑا تھا۔ اس نے سلام کیا۔ لیکن ادیب نے صبر و سکون اور بے چینی کے مابین کشمکش کو محسوس کرتے ہوئے ملتجی پر تیور لاکر آنکھیں بند کرلیں۔ . . . . ان کے لب آہستہ آہستہ پھڑک رہے تھے۔ گویا ایک صدیوں سے آشنا، پُر حلاوت، جذبات سے لبریز، ایک قسم کے ہسٹریکل (Hysterical) بوسے کے لئے مرتعش ہوں . . . . . اور جیسے اُن کی رُوح عریاں ہو کر قلب کی اندرونی

ماہینوں میں ایک ایسے ہلکے ہلکے، میٹھے، مدہوش کن صوتِ ازل اور ایک ایسی خنک سی تجلی کی متلاشی ہو جو اس مقام ہُو کی عمیق، بیکراں تاریکیوں میں اُس کے لئے شمع بردار ہو جائے۔ اور اُس کی رہنمائی کی وجہ سے وصلِ تمام ممکن ....

جلال نے اپنے بائیں طرف ادیب کی تصنیف کردہ کتابوں پر ایک چھلکتی ہوئی نظر ڈالی۔ الماری کے پاس ہی اخروٹ کی لکڑی کا ایک ہشت پہلو میز دھرا تھا۔ اس میں کہیں کہیں سپید گلکاری کی ہوئی تھی۔ میز کے اوپر قلم دوات، چائے کی ایک پیالی اور ایک دُہرا کیا ہُوا کاغذ پڑا تھا۔ جلال نے کاغذ کو ہاتھ میں لے لیا۔ لکھا تھا۔

'بوڑھے کے آنسو چارسُو بکھرے پڑے تھے۔
اُس نے ساری عمر کوئی ڈھنگ کا کام نہ کیا تھا۔
بوڑھے نے سر اٹھایا اور کہا ——
زندگی کے اسباب بکھرے پڑے ہیں،
سخی معشوق کی مسکراہٹوں کی مانند،
کسی غریب کے دل کی جمعیت کی مانند،
صرف ایک سبق رہ گیا ہے —— پشیمانی کا،
—— آموت! وہ بھی سکھا دے۔

"حبیب"

جلال کی طبیعت پریشان سی ہوگئی۔ وہ بے پرواضرور تھا مگر ایک لطیف ذہن اور ایک حساس دل کا مالک تھا۔ اُسکے مزاج کی مستقل دیوار متزلزل ہوگئی۔ اُسے یُوں محسوس ہوُا جیسے کئی زرد، نیلے، سُرخ، مبہم سے حلقے ایک دوسرے میں خلط ملط ہوکر اس کی آنکھوں کے پاس کن پٹی سے چھوکر، انواع واقسام کی اقلیدسی اشکال پیدا کرتے ہوئے فضا میں دُور و نزدیک پھیل رہے ہیں۔ اس کے ذہن میں آہستہ آہستہ ایک خلجان سی پیدا ہوئی۔ ایک غنودگی یا نیم غشی کی سی حالت میں اس کے قلب میں یک لخت ایک تحریک، ایک زبردست سی رو پیدا ہوئی۔ اور اُس نے چاہا۔ کہ وہ اپنے سامنے میز پر پڑی ہوئی پیالی کو اوندھا کردے۔ یہ بے مطلب، لاحاصل خواہش کیوں پیدا ہوئی۔ جلال نہ جان سکا۔ وہ صرف اس بات سے واقف تھا۔ کہ ایک اندرونی طاقت اُسے ایسا کرنے پر مجبور کر رہی تھی۔ ایک لمحہ کے لئے اُس نے دل کے ساتھ تصفیہ کر لیا کہ وہ ہرگز ہرگز پیالی کو اوندھا کرنے کے سے فضول خیال کو عملی جامہ نہیں پہنائے گا . . . . . بلکہ اس قسم کے خیال پیدا ہونے پر اس نے اپنی کمزور طبیعت کو کوسا۔ لیکن تھوڑی دیر کے بعد اس نے دیکھا۔ کہ جب تک وہ پیالی کو اوندھا نہ کرے گا۔ اسکے لئے زندہ رہنا مشکل ہوجائے گا ——— مشکل، ناممکن . . . . اور سب کے دیکھتے ہوئے

اُس نے پیالی کو اوندھا کر دیا۔ تھوڑی سی چائے میز پر سے بہتی ہوئی فرش پر گر گئی۔ سب حیرت سے جلال کی طرف دیکھنے لگے۔ ..... اسکے فوراً بعد ہی اسی قسم کا خیال پیدا ہوا کہ وہ رو دے۔ اس وقت جلال نے اپنی ذہنی تحریک کے خلاف جانا بالکل بے سود سمجھا۔ وہ جانتا تھا۔ کہ اب نہ رونا اسکے بس کا روگ نہیں۔ اسوقت اُس نے اپنے آپ کو مکمل طور پر اندرونی حکم کے تابع کر دیا۔ اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ ....

محفل عیش و انبساط سے نکل کر اس فوری درد و کرب کی فضا میں جہاں قہقہوں کی بجائے آنسو، جوانی کی بجائے بڑھاپا، ناکردہ گناہوں کی پشیمانی، موت گھوم رہے ہوں۔ اُس کا جی نہ لگا۔ جلال نے ایک عجیب انداز سے نتھنے پھڑکائے۔ اور نئے جلائے ہوئے سگرٹ کی راکھ کو چٹکی سے گرایا اور دل میں کہا۔ کہ کہیں سگریٹ کو باہر پھینکدینے کا خیال اس کے ذہن میں نہ پیدا ہو جائے۔ وہ کانپ اٹھا اور برقی رو آنے سے پیشتر جلال ایڑیوں کے بل چلتا ہوا کھڑکی میں پہنچا۔ اور سگریٹ کو باہر پھینکدیا۔ دُور... بہت دُور، جتنی دُور اُس سے ممکن تھا۔ اور روکھی سی مسکراہٹ لبوں تک لاتے ہوئے سوچنے لگا۔ بھلا ایک مکمل آدمی، محض ایک معمولی سبق پشیمانی کی خاطر موت کو دعوت دیتا ہے۔ ناگاہ اُسے یاد آیا۔ کہ اسی نوعیت کا ایک اور خیال بھی چچا نے اپنی کتاب 'رنگ و آہنگ' میں ظاہر کیا تھا۔ کہ

انسان اس قدر خود سر اور خود بیں ہے۔ کہ اس پر آسمان کی گردش سے جتنی بھی بلائیں نازل ہو سکتی ہیں یکسر نازل ہو جائیں۔ تو بھی انسان خود کردہ فعل کو غلطی یا گناہ کہنے اور صحیح طور پر پشیمان ہونے کی بجائے لچر باتوں سے دل کی تسلی کے سامان بہم پہنچائے گا۔ وہ ہر وقت بچپن کے گناہوں کو طفلانہ پن، جوانی کے گناہوں کو جوانی نادانی پر اور بڑھاپے کے گناہوں کو انسانی "ناتوانی اور کمزوری کے سر تھوپے گا۔ حتےٰ کہ حد سے زیادہ دیر ہو جائے گی۔ اور موت اپنے تلخ جام کے ساتھ اُسکے ہر رگ و ریشہ میں پشیمانی کا سبق سرایت کر دے گی۔ ایک عمیق اور تنقیدی نظر اپنی مختصر سی زندگی پر ڈالتے ہوئے جلال نے کہا۔ کس قدر درست بات ہے ——— برس پندرہ یا کہ سولہ کا سن۔۔۔ قیامت کب کسی نے دیکھی ہے۔۔۔۔۔ یہی دن تو ہیں،۔۔ اور اُسکے اس قسم کے سینکڑوں کلمات اب تک ایتھر میں لہروں کی صورت گھوم رہے ہوں گے۔

"میں جلال سے کچھ کہنا چاہتا ہوں"۔ دفعتہً جلال کے چچا نے بہت نحیف آواز سے کہا۔ اور نہایت آرام و سکون سے اپنی آنکھیں اُسطرف پھیر لیں۔ جلال تیزی سے چچا کی چارپائی کے نزدیک دو زانو ہو کر بیٹھ گیا۔

"سکینہ ـــــ سامنا دروازہ تو کھول دو ـــــ مجھ تک ہوا آنے دو۔" ادیب نے پھر کہا۔

ایک لمحہ کے لئے چاروں طرف خاموشی چھا گئی۔ سکینہ نے دروازہ کھولا۔ ٹھنڈی ہوا ایک دم فراٹے سے اندر داخل ہوئی .... سب نے ادیب کے چہرے پر نظریں جما دیں۔

"باہر بارش اچھی ہو گئی ہے نا؟"

"جی چچا جان ... کافی برس گیا، پانی۔"

اور اپنی دھندلی آنکھوں ہیں سے باہر دیکھتے ہوئے ادیب بولا۔

"دنیا کس قدر وسیع ہے .... رنگین اور بے رنگ بھی ـــــ"

"جی ہاں ... بہت وسیع ہے۔ رنگین اور بے رنگ بھی۔" جلال نے چچا کے تخیل کی رو کو سرعت سے بدلتے ہوئے دیکھ کر حیرت سے دہرایا ادیب کے اس طور باہر دیکھنے پر سب لوگ باہر کی طرف دیکھنے لگے۔ باہر کچھ بھی نہ تھا۔ صرف سخت سردی میں ایک اندھا لاٹھی ٹیکتا ہوا جا رہا تھا جلال نے چچا کی طرف دیکھا۔ اُس نے محسوس کیا کہ چچا کچھ کہنے کو تھے۔ مگر قوت ارادی کی ناتوانی کی وجہ سے کہہ نہ سکے۔ جلال نے دیکھا دوبارہ حد سے زور لگاتے ہوئے چچا نے کہا۔

"دیکھو جلال بیٹا .... باہر ایک اندھا جا رہا ہے۔ اس کے

راستہ پر نشیب و فراز دونو ہیں جنہیں وہ دیکھ نہیں سکتا۔ تاہم اُسے چنداں فکر لازم نہیں۔ اُسکے پاس لاٹھی ہے"

ایسے معلوم ہؤا جیسے یہ بات کہنے میں ادیب نے اپنی تمام قوت صرف کر دی ہو۔ اُن کو دو ہچکیاں سی آئیں۔ اور اس سے پہلے کہ فضا میں ہا وہو کی آوازیں لرزش پیدا کر دیں۔ ان کا جسم ساکت ہو گیا۔ اور برف کی مانند ٹھنڈا!

(۲)

چچا حبیب احمد کو کفنانے دفنانے کے بعد واپس لوٹتے ہوئے جلال ایک ارتعاش سوزاں محسوس کرتا ہؤا بازار کی رونق میں سے گذر رہا تھا۔ سینتیس ۳۷ برس کی عمر خود کو چچا کے مقابلہ پر لاتے ہوئے وہ اپنے آپکو زیادہ معمر محسوس کرنے لگا۔ اور شاید زیادہ تجربہ کار۔ لیکن اس کے خیال میں تلافیِ مافات کے لئے بہت دیر ہو چکی تھی ـــــ بہت دیر . . . . . اور وہ مفردات جو کہ انسان کی بہتری کے لئے جمع ہوتے ہیں اپنی تخریب سے بدن میں کپکپی پیدا کر رہے تھے۔ یکایک اُس کے رونگٹے کھڑے ہونے شروع ہو گئے۔ اور اُسے کانوں میں سائیں سائیں اور نفس کی نوع بہ نوع، موافق اور ناموافق سی آوازوں کے درمیان چچا کے آخری

الفاظ گونجتے سُنائی دیئے ـــــ "باہر ایک اندھا جا رہا ہے ۔ اُس کے راستے پر نشیب و فراز دونو ہیں ۔ جنہیں وہ دیکھ نہیں سکتا ۔ تاہم اُسے چنداں فکر لازم نہیں ۔ اسکے پاس لاٹھی ہے۔"

"کیا یہ الفاظ کسی تشبیہہ مجازی کے حامل تھے یا یونہی ایک گذرتے ہوئے نابینا کو دیکھ کر ایک علیل دماغ کی واہی تباہی ـــــ ؟" جلال نے اپنے آپ سے سوال کیا ۔ پھر جلال نے سوچا "چچا استادِ استعارہ مانے جاتے تھے اور یہ کبھی ممکن نہیں کہ اپنے حواس کی موجودگی میں وہ الفاظ انھوں نے بے معنی طور پر اور اتفاقاً کہے ہوں گے ۔ ۔ ۔ پھر اُس نے اپنی تمام تر علمیت جو کہ اب گذرے ہوئے زمانہ کی ایک حسین یادگار رہ گئی تھی طلب کیا ۔ اور دل ہی دل میں اُن الفاظ کی تفسیر و تشریح کرنی شروع کی ۔

خوانچے والوں کی آوازیں، اخبار بیچنے والوں کا شور و غوغا، سینما والوں کے بیانگِ دہل اعلان، ریڈیو میکنک کی دکان کے اندر امپلی فائر کی مدد سے بلند ہوتا ہوا گانا ۔ خوبصورت نیو ماڈل کاروں کے ہارن اُس کے کانوں میں جگہ پانے سے قاصر رہے ۔ اُس کے پاس ہی سے ایک مونگئے رنگ کی ڈاج سیڈان گذری ۔ جس کو ایک مونگئے رنگ کی وردی کا شوفر چلا رہا تھا ۔ کار کے اندر ایک نازنین اسی رنگ کی ایک کریپ

کی نہایت خوشنما ساڑھی پہنے بیٹھی تھی۔ گذرتے ہوئے لوگ رنگ کی اس مشابہت ومطابقت دیکھ کر دل ہی دل میں مسکرا رہے تھے۔ جلال جو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر کار کی آخری سیٹوں کو دیکھا کرتا تھا۔ اُس نے صرف ایک نظر سے اُس کار میں دیکھا۔ اُسکے فوراً بعد ہی اُس کی نظر چند بھک منگوں کی طرف چلی گئی۔ اور اُس نے محسوس کیا۔ جیسے کوئی کہہ رہا ہو" دنیا کس قدر وسیع ہے، رنگین اور بے رنگ بھی" —— اور جلال زمین پر نظریں گاڑے ہوئے وہاں سے گذر گیا۔

رِٹز ریسٹوران کے خانساماں نے اپنے گاہک جلال کو اپنے کیبنے کے نزدیک رُکتے ہوئے دیکھ کر کہا " حضور، پیرس سے پنیر کے دو ورقے سموسے آئے ہیں، شامپین سے اُن کا خاص . . . . "

جلال نے ایک سخت نگاہ سے خانساماں کیطرف دیکھا اور کہا " پیچھے ہٹ جاؤ نامعقول " اور خود آگے بڑھ گیا۔

" چچا آخر کتنا سادہ آدمی تھا" جلال نے سوچا۔ اور نفس کُش، صحیح معنوں میں کفایت شعار، خرچ کرنے کی جگہ خرچ کرنے والا، خاموش، سنجیدہ مزاج، مگر بولنے کی جگہ جوشیلا مقرر . . . . حقیقت اور اصلاح کے لئے قدرت کی مثبت و منفی دونوں طاقتوں کا استعمال کرنے والا —— آخر وہ مکمل آدمی تھا"

——— ایک دفعہ پھر اُس کے کانوں میں ادیب کے آخری الفاظ گونجے۔ جس طرح تمام روئے زمین پر پھیل چکنے کے بعد ابھر میں پھر ایک معیّن وقفہ کے بعد لہر آتی ہے ——— ”باہر ایک اندھا جا رہا ہے۔ اُس کے راستہ پر نشیب و فراز دونو ہیں۔ جنہیں وہ دیکھ نہیں سکتا۔ مگر اُسے چنداں فکر لازم نہیں اُسکے پاس لاٹھی ہے۔

تمام پریشانیوں سے اپنی توجہ کو یکسو راغب کرتے ہوئے اب جلال نے مرحوم چچا کے آخری الفاظ کی تفسیر کرنی شروع کی۔ یکایک اُس کی گالوں پر ایک ہلکی ہلکی سرخی جو شفق پر سورج کی پہلی کرن کے نمودار ہونے یا حجلۂ عروسی میں پہلی مرتبہ متقابل جنس کے بازوؤں میں مستغفی ہونے سے دلہن کے چہرے پر ہویدا ہوتی ہے نمودار ہونے لگی۔ اور ایک تلخ سی مسکراہٹ جو دوشیزگی کے وقار کو کھونے کے باوجود پیدا ہوتی ہے۔ مسکراتے ہوئے اُس نے کہا۔

”آخر کتنا عمیق تھا چچا کا مطالعہ۔ انسان کی زندگی کے غیر ضروری، ناقابل توجہ واقعات سے وُہ روزانہ سبق لیتے تھے۔ زندگی کی ہر لطیف جنبش سے اُنھوں نے کچھ نہ کچھ اخذ کیا۔ حتےٰ کہ موت سے پشیمانی۔ اس کی تفسیر اس کے سوا اور کیا ہوسکتی ہے۔ کہ انسان اپنے مستقبل یعنی زندگی کے نشیب و فراز اور اونچے نیچے راستہ پر ایک بے خبری کے عالم

میں جا رہا ہے۔ کیونکہ وہ ہونے والے واقعات سے آگاہ نہیں۔ وہ اونچی نیچی جگہ کو دیکھ نہیں سکتا۔ جس طرح اندھا آدمی اپنی لاٹھی کی مدد سے اپنا راستہ نشیب و فراز، پانی اور کیچڑ وغیرہ میں سے نکال لیتا ہے اس طرح آدمی اپنی دور اندیشی کی لاٹھی سے اپنی زندگی کو بے خطرہ اور استوار بنا سکتا ہے۔ جس اندھے کے پاس لاٹھی اور جس انسان کے پاس دور اندیشی نہیں۔ وہ دنیا کے نشیب و فراز، پانی اور کیچڑ میں منہ کے بل گرے گا۔"

جلال نے کلائی پر سے چسٹر کی آستین ہٹاتے ہوئے وقت دیکھا۔ ساڑھے سات بجے تھے۔ اور سردیوں میں ساڑھے سات بجے اچھا خاصا اندھیرا ہو جاتا ہے۔ دھند نے سورج کے غروب ہوتے ہی تمام شہر کو اپنی آغوش میں لے لیا تھا۔ . . . اور یہ بلیرڈ کلب میں جانے کا وقت تھا۔

بلیرڈ کلب، سموکنگ کلب، پرپل کلب یہ سب ایک ہی بات تھی۔ یہ سب مہذب مرد عورتوں کی تفریح گاہیں تھیں۔ جلال نے اپنی جیب ٹٹولی پرسوں کی سویپ اور پرپل میں اُس نے نہتر روپے جیتے تھے۔ جلال کو وہ کھجلی سی محسوس ہونے لگی۔ جو ہر ایک جیتنے ہوئے کھلاڑی کو اور داؤ لگا کر سب کچھ گنوا دینے کے لئے اُکساتی ہے۔ جلال ایک قدم رُک گیا

چسٹر کی دونوں جیبوں میں ہاتھ ڈالتے ہوئے اُس نے فیصلہ کُن افرار دو عوے سے کہا کہ وہ یقیناً ان روپوں کو کسی بہتر کام میں صرف کریگا۔ وہ اپنی بھولی بسری بیوی کے لئے گرم ساڑھی لائے گا یا اپنے بڑے بیٹے کے لئے جو ایک مقامی کالج میں ایف اے کا متعلم تھا۔ ایک چھوٹی سی لائبریری خریدے گا۔ وہ نظارہ اُس کی آنکھوں کے سامنے پھر گیا جبکہ اُس کے بیٹے نے نہایت اشتیاق سے کتابیں خرید کر لا دینے کی التجا میں انگلستان کے بڑے بڑے پبلشر انگلیوں پر گن ڈالے تھے۔

آج پھر جلال نے اپنی گذشتہ زندگی پر ایک نظر ڈالی۔ اُس نے دیکھا کہ تمام گذشتہ وقت، جوانی کا بیش قیمت زمانہ اُس نے عیش و نشاط کی محفلوں، مہذب بدمعاشوں کی صحبتوں، طوطا چشم ایکٹرسوں کو طول و طویل چٹھیاں لکھ کر اُن کی تصاویر منگوانے میں گنوا یا تھا۔ اور خود کو اُس اندھے کی مانند بنا دیا۔ جس کے پاس لاٹھی نہ ہو۔ اور جسے ہر طرح کا فکر لازم ہو۔ اور اب بھی وہ زندگی کے نشیب و فراز میں دوراندیشی کی لاٹھی کے بغیر بھاگا جا رہا تھا۔ اور وہ بھی بے تحاشا!

اس نے بازار میں گذرتے ہوئے تمام آدمیوں کو دیکھ کر انسانی فطرت کے مطابق اپنے دل کو تسلی دینی شروع کی ——

"ان میں سے کسی کے پاس لاٹھی نہیں ہے۔ اگر ان میں کوئی سنبھلا

ہُوا ہے بھی تو وہ شخص ہے جو کہ لاٹھی کے نہ ہوتے ہوئے بے تحاشا نہیں بھاگتا۔ بلکہ استقلال سے قدم بہ قدم چل رہا ہے۔"

"مجھے کم از کم بے تحاشا نہیں بھاگنا چاہیئے"۔ جلال نے دل ہی دل میں خود کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ اُس نے دیکھا کہ وہ خوبصورت استعارے کے زیرِ اثر خود بھی سُست پڑ گیا ہے۔ اُس کی رفتار ایک عام کاروباری آدمی کی رفتار سے بہت کم ہو گئی تھی۔ جلال نے اپنی رفتار تیز کر دی۔ اور تیز چلتے ہوئے اُس نے قدرے اونچی آواز سے کہا۔

"اپنی وہ لاٹھی جو میں نے گھر کے ایک کونے میں پھینک رکھی ہے۔ اور جس کی ہستی کو بھی بھول چکا ہوں۔ محنت اور کاوش سے ڈھونڈ نکالوں گا اور اُسے استعمال کیا کروں گا۔"

(۳)

شہر کے قمار خانے کی شکل پیگوڈا سے مشابہت رکھتی تھی۔ بنکوک کے ایک اعلیٰ کاریگر نے اُسے بنایا تھا۔ اُس کے چاروں طرف پینتالیس سیڑھیاں تھیں۔ اور صبح و شام شہر کے لوگ سمندر سے آنے والی ہوا سے لطف اندوز ہونے کے لئے وہاں جمع ہو جاتے۔ شراب کے متعلق ملک کے اس حصّے کا قانون سخت گیر نہ ہونے کی وجہ سے کئی شخص پینے کے

بعد ایک سیڑھی پر بازو رکھ کر اُسے تکیئے کے طور پر استعمال کرتے ہوئے باقی کا جسم نچلی سیڑھی پر رکھے پڑے رہتے تھے۔ جس طرح کسی بڑے دریا کے ریتیلے کناروں پر گھڑیال دھوپ تاپنے کے لئے پاؤں پھیلا کر دنیا و مافیہا سے بے خبر پڑے رہتے ہیں۔ جلال حسب معمول ان انسان نما گھڑیالوں یا گھڑیال نما انسانوں سے بچتا بچاتا قمارخانے کے اندر داخل ہوُا۔ اُسکے ساتھی جو دو دن سے اُس کا انتظار کر رہے تھے۔ نہایت خلوص سے اُسے ملے۔ مگر جلال دردِ سر کا بہانہ کر کے ان سے معذرت کا خواہاں ہوُا اور ایک آرام کرسی میں دھنس گیا۔

جلال صبح سے بھوکا تھا۔ اور حالت گرسنگی میں آدمی لطیف سے لطیف خیالات تک رسائی حاصل کر سکتا ہے۔ جلال جس کا پیٹ طرح طرح کے کھانوں کے علاوہ حرص وہوا سے تنا رہتا تھا۔ آج اس قابل تھا کہ اُسے دُور کی سوجھ سکے۔ اور وہ گذشتہ زندگی اور روزمرہ کے واقعات کا تصوّر کر کے پریشان و پشیمان ہو بظاہر اس کی آنکھیں قمار بازوں کے سر پر لٹکی ہوئی قندیل پر جمی ہوئی تھیں۔ مگر دراصل وہ نیم خفتہ و نیم بیدار حالت میں تھا۔ اُسے مس میگی کا گھر وکھائی دیا۔ مس میگی شروع شروع میں ایک یوریشین سوسائٹی گرل تھی۔ اور ایک بڑے بلند مرتبت خاندان کی چشم و چراغ۔ اُسے پنٹنگ (PUNTING) کی لت پڑ گئی۔ بک میکرز

نے اُسے خوب لوٹا۔ آہستہ آہستہ وہ اپنے آپ کو بیچنے لگی۔ اوراب اس کے ہاں امیر آدمیوں کا تانتا بندھا رہتا تھا . . . . . .

تصور میں جلال نے اپنے آپ کو میگی کے دروازے پر کھڑا پایا۔ اُسے دیکھتے ہی وہ دوڑی دوڑی اُسے لینے کے لئے دروازے تک آئی۔ کیونکہ جلال مس میگی کا مستقل، مالدار اور قدرداں گاہک تھا۔ میگی نے اسی انداز سے جو شکایت سے تہی نہ تھی۔ پوچھا۔

"تم گذشتہ دو شب کہاں رہے جلال؟ . . . . . تمہاری طبیعت مضمحل نظر آتی ہے کچھ۔"

ایک اور سرو قد بت تھا۔ جو کہ میگی کے مقابل آکر کھڑا ہو گیا۔ وہ بُت قدرے دھندلا سا دکھائی دیتا تھا۔ اور معلوم ہوتا تھا کہ اُس بُت کے منہ میں زبان نہیں ہے۔ مگر پھر بھی کچھ کہنے کی کوشش کر رہا ہے، یکایک اُس بت نے بھی وہی الفاظ دہرا دیئے۔ وہ بت جلال کی بھولی بسری بیوی تھی۔ جلال نے اپنی بیوی اور میگی کے استفسار کا مقابلہ کیا۔ بیوی اُسے اُسی کے لئے چاہتی تھی۔ اور کبھی کبھی شکایت کے آنسو گراتے ہوئے پوچھتی ——"میں کہتی ہوں . . . . . آپ دو رات کہاں رہے۔ میں یہاں اکیلی تڑپتی رہتی ہوں۔" اور وہ آواز مطلق تصنع اور ناز و انداز کی حامل نہ تھی۔ بلکہ دل ہی سے دماغ سے مشورہ لئے بغیر اُس کے خیالات لبوں

تک آ جاتے۔ لیکن میگی جلال کو جلال کے لئے نہیں۔ اُس کی جیب کے لئے
چاہتی تھی۔ جو عموماً نہیں بلکہ ہمیشہ معمور ہوتی تھی۔

"فیراڈے ۔۔۔۔ اس دفعہ پھر ہار گیا جلال —— فیراڈے ہار گیا۔"
میگی نے جلال کو تاسف سے بھری ہوئی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا
"اُسے ہارنا ہی چاہئے ۔۔۔۔" جلال نے جواب دیا۔ اور پھر بولا۔ "میرے
عزیز چچا حبیب احمد کل فوت ہو گئے ہیں ۔۔۔۔" اس وقت اُس کی رحم
طلب نگاہیں وہاں بیٹھے ہوئے دو ایک آدمیوں کی طرف اُٹھ گئیں، تمام
نے افسوس اور ہمدردی کا اظہار کیا۔ اُن میں سے ایک نے یہ بھی محسوس
کیا۔ کہ جلال نے اس عیش و نشاط کے موقع پر یہاں آ کر اپنی افسردہ دلی سے
تمام انجمن کو افسردہ کر کے اپنی کم فہمی کا ثبوت دیا ہے۔

میگی نے کئی ایک باتوں سے جلال کو تسلی دینی شروع کی۔ اور یہ بھی
کہا کہ اس کے نہ آنے سے کتنی بجلیاں تھیں۔ جو اُس پر کوندیں۔ اور کتنے وسوسے
تھے جو اُسکے دل میں آئے ۔۔۔۔

جوں جوں وہ یوریشین لڑکی خوشامد کرتی توں توں جلال کا دل اس سے
متنفّر ہوتا —— اُس نے ایک ہاتھ اپنی جیب پر رکھ لیا۔ جس کو بچانے کا
صرف آج کے لئے ہی نہیں۔ بلکہ ہمیشہ کے لئے اُس نے تہیہ کر لیا تھا۔ میگی
کے پیش کردہ ہاتھ کو پرے دھکیلتے ہوئے ایک روکھی پھیکی مسکراہٹ

سے جلال نے کہا " تمہیں ایک خبر سناؤں میگی . . . چچا اپنی جائداد کا ایک بڑا حصہ میرے نام چھوڑ گئے ہیں "

" سچ ؟ " میگی نے آنکھیں پھاڑتے ہوئے کہا - یہ بات صحیح معنوں میں اُس کے لئے دل خوش کن اور دل نواز تھی - وہ اپنی خوشی کو فریب نظر کے دامن میں مستور نہ کر سکی . اگرچہ یہ اُس کے پیشے کی خصوصیت ہوتی ہے - اور وہ چھپاتی بھی کیسے ؟ جبکہ جلال کی نظر نہایت باریک بیں ہو گئی تھی - اور اس وقت وہ فولاد کے آر پار بھی دیکھ سکتی تھی -

" علاوہ اور چیزوں کے چچا مجھے ایک لاٹھی دے گئے ہیں —— تاکہ میں ٹٹول ٹٹول کر اپنا راستہ بنا لوں - اور نشیب و فراز میں نہ گر دوں " جلال نے اپنے آپ کو کہتے ہوئے پایا -

" کیسی بہکی بہکی باتیں کرتے ہو جلال . . . . لوپی کر بے نیاز ہو جاؤ "
—— اور میگی نے سمجھا کہ یہ صرف چچا کی موت کا گہرا اثر ہے - جلال نے اُس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا -

" تمہارا شباب زوروں پر ہے . . . "
میگی نے اپنے جسم پر ایک چھلکتی ہوئی نگاہ ڈالی - اور مسکرائی -
" کل ڈھل جائے گا "
مس میگی نے دوسری دفعہ اپنے جسم کی طرف دیکھا - اور خون اُسکے

رخساروں اور کانوں کی طرف دوڑنے لگا۔

"تم بوڑھی ہو جاؤگی اور پھر تمہیں کوئی نہ پوچھے گا۔ ۔ ۔ ۔ یہ جتنے بھی بیٹھے ہیں۔ اور میں خود بھی ——" اس نے اپنی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "تمہارے شباب کے خریدار ہیں۔ جوانی کی شام ہونے پر یہ سب لوگ اپنے اپنے گھروندوں میں جا گھسیں گے۔ تم کو کوئی نہ پوچھے گا۔ پھر تم کیا کروگی مینگی؟"

"یہ سوال تو میں عنقریب ہی تم سے کرتی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کیا تم اُس وقت میری خبرگیری نہ کروگے؟"

"ایسا نہیں ہوا کرتا مینگی، شباب کی رعنائیوں کے خریدار عمر کے ساتھ بوڑھی ہونے والی رعنائیوں کی کھوٹے داموں بھی قیمت ادا نہیں کرتے۔ اگر تم پنٹنگ میں تباہ ہونے کے فوراً بعد ہی شوہر کر لیتیں۔ تو گو زندگی ظاہرا طور پر عیش سے نہ گزرتی۔ تب بھی تمہارا انجام خراب نہ ہوتا۔ عورت سے وابستہ وہ آدمی جسے شوہر کہتے ہیں، اپنے بڑھاپے میں معمر بیوی کی بوڑھی اور بھونڈی رعنائیوں کی بھی وہی قیمت ادا کرتا ہے۔ جو اس نے جوانی میں ادا کی ہوگی —— بلکہ اس سے بھی زیادہ —— میں نے تمہارے شباب کو عزیز کیا ہے۔ اور اُسکے لطف کو خریدا ہے۔ مگر بیوی نے بغیر دام لئے اپنے شباب کے جامِ خلوص اور ایثار سے مجھے پلا دیئے۔ اسلئے

وہی ایک ہستی ہے۔ جو میرے جذبہ ایثار پر تسلط جمانے کا حق رکھتی ہے...
.... میگی! تم اُس اندھے کی مانند ہو جو کہ بے تحاشا بھاگا جا رہا ہو۔ حالانکہ اُس کے پاس لاٹھی بھی نہیں۔ تم نے اپنی لاٹھی یہیں کہیں گھر کے کسی کونے میں بھول کر ڈال دی ہے۔ اُٹھو اسے ڈھونڈھ نکالو۔ اور اسے اپنے مستقبل میں اپنی راہ نشیب و فراز اور کیچڑ سے بچ کر نکال لو۔ ۔ ۔ ۔ ورنہ رنج د آرام کی گہرائیوں میں جا گروگی ——"

جلال کی آنکھ کھل گئی۔ اُس نے آخری الفاظ نہایت زور سے کہے تھے۔ قمار خانے کے سب آدمی جلال کی طرف گھور رہے تھے۔ جلال کچھ گھبرا سا گیا۔ اُس نے ویسے ہی اونچی آواز میں کہا۔

"یہ میرے ادیب چچا کے آخری الفاظ ہیں —— اور تم سب لاٹھی کے بغیر ہو۔ جو بالضرور مصائب کی خندق میں اوندھے منہ گروگے ——"

—— دوسرے لمحہ میں جلال بیگ ڈانما قمار خانے کی پنیتالیس سیڑھیوں کو بے تحاشا پھلانگتا ہوًا جا رہا تھا۔ اور اُسے اپنے پیچھے بے تحاشا، دیوانہ وار قہقہوں کی آوازیں سُنائی دے رہی تھیں *

موت کا راز

موت کا راز

اس بے ربط و ناہموار زمین کے شمال کی طرف نباتاتی ٹیلوں کے دامن میں، میں نے گندم کی بتیسویں فصل لگائی تھی، اور سرطانی سورج کی حیات کُش تمازت کے نیچے پکتے ہوئے سٹوں کو دیکھ کر میں خوش ہو رہا تھا۔ گندم کا ایک ایک دانہ پہاڑی دیمک کے برابر تھا، ایک سٹے کو مسل کر میں نے ایک دانہ نکالا۔ وہ کناروں کی طرف سے باہر کو قدرے پچکا ہوا تھا، اس کی درمیانی لکیر کچھ گہری تھی، یہ اس بات کا ثبوت تھی کہ گندم اچھی ہے۔ اس میں خوردنی مادہ زیادہ ہے۔ اور گورکھپور کی منڈی میں اس سال اس کی فروخت نفع بخش ہو گی۔

میرے خیالات کچھ یکسوئی اختیار کر رہے تھے، اس وقت زندوں میں سے میرے نزدیک کوئی نہ تھا۔ قدرتاً آپ پوچھ سکتے ہیں۔ کہ اگر زندوں میں سے کوئی تمہارے نزدیک نہ تھا تو کیا مُردوں کی یاد تمہارے ویران خانۂ دل کو آباد کر رہی تھی؟ ——— میرا جواب اثبات میں ہے، میں آپ سے ایک اور بات بھی اصرار سے منوانا چاہتا ہوں۔ اور وہ یہ ہے کہ میں مردوں کا تصور ہی نہیں کر رہا تھا۔ بلکہ ان کو اپنے سامنے اپنے پیچھے

دائیں اور بائیں کتھا کلی انداز سے رقص کرتے، ہنستے، اور خوف سے کانپتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ جس طرح آپ کی داڑھی کا بال بال مجھے علیحدہ نظر آتا ہے۔ اور آپ کی تمازت زدہ آنکھوں کے سرخ ڈورے دیکھ رہا ہوں اسی طرح میں انہیں دیکھ رہا تھا۔ اُن میں سے کسی کا چہرہ جموی مونیا کی اُس کلی کی مانند جسکا چہرہ صبح کے وقت کاشمیری بہار کی شبنم نے دھو دیا ہو، شگفتہ ہو کر چمک رہا تھا، اور کسی کے چہرے پر جھریاں اور گہری گہری لکیریں تھیں۔ شاید وہ کسی نتیجہ خیز تجربہ کی نشانیاں تھیں۔

وہ گندم کے کھیت کے کناروں پر نہیں کھیل رہے تھے۔ نہ ہی وہ جتیس سالہ شیشم جس کے گھنے سایہ دار پھیلاؤ کے نیچے میں آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا۔ اپنے ہلکے ہلکے پاؤں کو نچا رہے تھے۔ بلکہ وہ خود میرے جسم کے اندر تھے ...... ہائیں! آپ حیران کیوں کھڑے ہیں، آپ پوچھتے ہیں کہ میں کہاں تھا؟ ...... سنئے تو ......

.... میں جسم کی اس حالت میں تھا جسے انہماک کی آخری منزل کہنا چاہئے۔ میں خود اپنے جسم سے علیحدہ ہو کر اسے یوں دیکھ رہا تھا، جس طرح پرانی حکایتوں کا شہزادہ، کسی اونچے اور نباتاتی ٹیلے پر کھڑا دور سے اس شہزادی کے محل کا اُٹھتے ہوئے دھوئیں کے وجود سے اندازہ لگائے۔ جس نے اپنی شادی مشروط رکھی ہو۔

وہ رقصاں، خنداں، لرزاں لوگ میرے بزرگ تھے . . . . . بچہ اپنے والدین کی تصویر ہوتا ہے، میرا باپ اپنے باپ کی تصویر تھا۔ اس لئے میں اپنے دادا کی تصویر بھی ہو سکتا ہوں، اور یوں ارتقائی منازل طے کرنے کی وجہ سے اپنے بزرگانِ سلف کی اگر صاف نہیں تو دھندلی سی تصویر ضرور ہوں . . . . ہندوستانی تہذیب دو نسلوں سے شروع ہے، ایک دراوڑ اور دوسری آریہ۔ میں آریہ نسل سے ہوں۔ میرا دراز قد، گورا رنگ، سیاہ آنکھیں، باحس، من موجی، اور قدرے وہم پرست ہونا، اس بات کا ثبوت ہیں، —— یہ بات معلوم کرنے کی میری زبردست خواہش تھی۔ کہ موت کا راز کیا ہے۔ مرتے وقت مرنے والے پر کیا کیا عمل ظہور پذیر ہوتا ہے۔ مجھے یہ یقین دلایا جا چکا تھا کہ مادہ اور روح لافنا ہیں، ایسی حالت میں اگر وہ موت کے عمل میں اپنی ہیئت بدلتے ہیں۔ تو اُس وقت ان کی کیا حالت ہوتی ہے —— آخر مرنے والے گئے کہاں؟ وہ جا بھی کہاں سکتے ہیں۔ سوائے اس بات کے کہ وہ کوئی دوسری شکل اختیار کر لیں، جسے ہم لوگ آواگون کہتے ہیں کیونکہ مختلف ہیئات میں ظہور پذیر ہونے کے بعد پھر اس ذرہ کو جس سے کہ ہم پیدا ہوئے ہیں۔ آدمی کی شکل دیجاتی ہے۔

یہ بات سنکر شاید آپ بہت ہی متعجب ہونگے۔ کہ میں اپنے سامنے

اپنی پیدا ہونیوالی اولاد کو بھی دیکھ رہا تھا۔ میرے سامنے ایک گھنگریالے سیاہ بالوں، چمکتے ہوئے دانتوں والا حلیم و شخیم بچہ آیا، جو کہ آج سے ہزاروں سال بعد پیدا ہو گا۔ اور جو کہ میری ایک دھندلی سی تصویر تھا، میں نے اسے گود میں اُٹھا لیا۔ اور چھاتی سے لگا، بھینچ بھینچ کر پیار کرنے لگا، اسے پیار کرتے وقت فقط مجھے یہ ہی محسوس ہوا، جیسے میں اپنا دایاں ہاتھ بائیں کندھے اور بایاں ہاتھ دائیں کندھے پر رکھ کر اپنے آپ کو بھینچ رہا ہوں اس بچے نے کہا:۔

"بڑے بابا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ پرنام ۔ ۔ ۔ میں جا رہا ہوں"

میرا ہونے والا بچہ، اور بزرگانِ سلف تمام واپس جا رہے تھے۔ اس انہماک کے عالم میں میں ابھی تک دور کھڑا یہی محسوس کر رہا تھا۔ کہ میرا جسم زمین کا ایک ایسا حصہ ہے۔ جس میں میرے بزرگانِ سلف کی غاریں اور آئندہ نسلوں کے شاندار محل ہیں۔ جن میں رفتگان، اور آنے والے اپنے قدیم اور جدید طریقوں سے جوق در جوق داخل ہو رہے ہیں۔

۔ ۔ ۔ گھبرایئے نہیں، اور سنئے تو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یہ میری باتیں جو بظاہر پاگلوں کی سی دکھائی دیتی ہیں ہیں بڑی مطلب خیز ۔ ۔ ۔ مجھے کچھ سمجھا لینے دو ـــــ پھر میں آپ کو ادبی مضمون میں تشبیہ دینے کا طریقہ بتاؤنگا

کل ہی آپ کہہ رہے تھے، کہ درختوں پر گدھ شام کے وقت بیٹھے یوں دکھائی دے رہے تھے۔ جیسے کسی اونچے شیشم پر سنہری تربوز اوندھے لٹک رہے ہوں — کتنی بھونڈی تشبیہ کہی آپ نے! ....

(۲)

یہ تو میں جانتا ہی تھا، کہ روح کے علاوہ مادہ بھی فنا نہیں ہوتا مگر اس بات کو دیکھنے کی ایک آگ سی ہر وقت سینہ میں سلگتی رہتی تھی، کہ موت کے عالم میں، بظاہر فنا ہوتے ہوئے شخص یعنی ذرہ کی مجموعی صورت کو کن کن تخریبی و تعمیری مدارج سے گزر کر دوسری ہیئت میں آنا پڑتا ہے .... یعنی .... آخر .... موت کا راز کیا ہے؟

وہ ذرۂ عظیم، وہ جزو لا یتجزیٰ، جو کہ تمام ارضی و سماوی طاقت کا مغز ہے۔ کیسا منظم ہے۔ مثال کے طور پر اجرام فلکی کی گردش کا نظام لیجئے۔ اگر ان میں سے کوئی بھی جرم اپنے مخصوص راستہ سے ایک انچ بھی اِدھر اُدھر ہو جائے، تو کیسی قیامت بپا ہو جائے۔ چاند گرہن کے موقع پر ہم لوگ دان پن بھی کرتے ہیں۔ تو اسی لئے کہ وہی ایک ایسا وقت ہو سکتا ہے۔ جبکہ اجرام فلکی کا کشش ثقل سے اِدھر اُدھر ہو کر اور آپس میں ٹکرا کر مادہ ہیولیٰ کی شکل اختیار کر لینا ممکن ہے ہم آریہ

—— حساس، من موجی اور توہم پرست نہیں چاہتے۔ کہ ہم کوئی برا کام کرتے ہوئے تباہ ہو جائیں اور مادہ ہیولی کا ایک حصہ بن جائیں۔ دان پن سے اچھا کام اور کیا ہوگا؟

. . . . . آپ اسے تصوّف اوہام خشک اور ترش مضمون کہیں مگر یہ ان ہر سہ اقسام سے بالاتر ہے۔ ہاں ہاں! آپ نے پوچھا تھا کہ یہ ذرہ عظیم کیا ہے ———— یہ جاندار شئے کی ابتدائی صورت ہے۔ یہ عورت اور مرد دونوں میں زندہ ہے۔ تمام ارضی و سماوی طاقت کا مرکز ہے۔ شاید اس سے بہتر اس کی کوئی تعریف نہیں کر سکتا۔ اس کے متعلق میں ایک قیاس غیر مصدق جو بظاہر یاوہ گوئی دکھائی دیتا ہے، مگر ہے، بہت جامع اور درست ———— دہرا دینا چاہتا ہوں، وہ قیاس غیر مصدق ریاضی طبعیات کے ایک بڑے ماہر[1] نے کہا تھا

"ذرّہ . . . . جزو لا یتجزیٰ . . . . ہم نہیں جانتے کیا . . . . کچھ کرتا ہے —— ہم نہیں جانتے کیسے! . . . ؟ . . . !!
شاید ریاضی قواعد ضرب و تقسیم اس ذرے سے ہی ریاضی دانوں

---

[1] EDDINGTON —— IN HIS GIFFORD LECTURES

نے سیکھے ہیں، وہ دو سے چار، چار سے آٹھ اور آٹھ سے چوگنا ہو جاتا ہے . . . . اور پھر ہزاروں سے حیران کن طور پر ایک . . . . یہ تو سب جانتے ہیں۔ کہ وہ یہ سے وہ ہو جاتا ہے اور وہ سے یہ ہو جاتا ہے مگر اس بات پر سے پردۂ راز نہیں اٹھا، کہ وہ کیسے؟ جس دن یہ پردۂ راز اٹھے گا، تو موت کا راز منکشف ہونے میں باقی رہ ہی کیا جائیگا؟

چند دن ہوئے میں اسی اضطرابِ ذہنی میں مبتلا بیٹھا تھا۔ اور سرطانی سورج گندم کے سٹوں کو پکا رہا تھا۔ سٹے بالکل سوکھ چکے تھے اور اُن کی داڑھی اس قدر خشک ہوگئی تھی۔ ایک ایک بال کانٹے کی مانند چبھتا تھا، کچھ دبانے سے بال خود بخود جھڑنے لگتے۔ سٹے کو مسلتے مسلتے اسکا ایک بال میرے ناخن میں اتر گیا۔ اور لاکھوں ذرات جن کی میں مجموعی صورت ہوں۔ ان میں سے ایک ذرے کو جو کہ انفرادی طور پر ذرہ عظیم سے کم نہیں، اُسنے آگے دھکیل دیا، وہ ذرہ جو آگے دھکیلا گیا نامعلوم گذشتہ زمانے میں میرا کوئی بزرگ تھا، یا شاید آئندہ نسلوں میں سے کوئی —— یہ میں جان نہ سکا، بہر حال سٹے کا بال ان دونوں میں سے نہ تھا، وہ ایک بیرونی خارجی چیز تھی، جس کو میرے نظامِ جسم میں داخل ہونے کی قطعی مخالفت تھی۔ اس کا یوں میرے جسم میں چلے آنا اس مسافر کی مداخلت بے جا کی مانند تھا، جو لفظ "شارع عام نہیں ہے"

پڑھتے ہوئے بھی اندر گھس آئے۔ یہ ممانعت قطعی کی وجہ ہی تھی۔ کہ درد سے ٹیس اُٹھ اُٹھ کر مجھے لرزہ براندام کر رہی تھی ـــــ

بھلا ایک کتا اپنی گلی میں دوسرے کتے کو نہیں آنے دیتا، تو میرے قابلِ پرستش بزرگوں اور معرکتہ الآرا کام کرنے والی آئندہ نسلوں کی عظیم الشان ہستیاں اس خارجی چیز کی مداخلت بے جا کو کب برداشت کر سکتی تھیں۔ اُف درد! ماسوا اس چیز کے ـــــ اس ذرے کے جو کہ ہماری آئندہ نسلوں کا اپنی ضرب و تقسیم کے ساتھ روحانی اور جسمانی بت بنے، یا ہمارے بزرگوں سے ہمیں ورثہ میں آئے۔ کسی اور چیز کو مطلق دخل نہیں۔ مادہ اور روح دونوں اس وقت تک چین نہیں پاتے جب تک کہ خارجی مادے کو ہر ایک تکلیف سہ کر جسم سے باہر نہیں پھینک دیا جاتا۔

وہ ذرہ تو ہر جنبش سے اثر پذیر ہوتا ہے۔ اگر آپ نے غلط روی سے اپنے جسم و روح کے نامناسب استعمال سے انہیں کسی طرح مفلوک اور ناتواں بنا دیا ہے۔ تو آپکے وہ ذرّے جنہوں نے آپکے بیٹے اور پوتے بننا ہے، مفلوک اور ناتواں حالت میں آپکے سامنے آکر آپکے دلی اور ذہنی اضطراب کا باعث ہونگے وہ اسے قسمت و تقدیر کہیں گے۔ لیکن اگر قسمت کی تعریف مجھ سے پوچھیں۔ تو وہ یہ ہے "صحبت نیک و بد

کے اثر کے علاوہ جو چیز پوری ذمہ داری سے ہمارے بزرگوں نے ہمیں دی ہے۔ وہ ہماری قسمت ہے۔" اس لیئے آپ جو بھی فعل کریں۔ سوچ کر کریں۔ انگلی بھی ہلائیں تو سوچ کر . . . . . یاد رکھیئے۔ یہ ایک معمولی بات نہیں ہے . . . . . اب شائد آپ ذرے کے قول و فعل سے کچھ واقف ہو گئے ہونگے۔

(۳)

اُس دن جس دن کہ بٹے کا بال میرے ناخن میں داخل ہوا۔ میں بہت مضطرب رہا ——— شام کو میں گھبرائے ہوئے پاس ہی کے ایک شہر کے کسی بڑے اختر شناس کے پاس گیا۔ اُس نے میری راس وغیرہ دیکھتے ہوئے قیافہ لگایا۔ اور مجھے کہا۔ کہ برہسپت کا اثر تمہیں ہر بلا سے محفوظ رکھے گا۔ اور تمہاری عمر بہت لمبی ہے۔ اس کا شاید خیال ہو، کہ درازئ عمر کی پیشین گوئی سنکر یہ مالدار زمیندار اپنے بائیں ہاتھ میں چمکتی طلائی انگوٹھی اتار کر دے دیگا۔ مگر یہ بات سُنکر مجھے سخت بے چینی ہوئی، ایک مایوسی کے عالم میں میں نے اُسے اس کی قلیل فیس ——— ایک ناریل، آٹا، اور پانچ پیسے دیدیئے . . . . . میں تو مرنا چاہتا تھا اور دیکھنا چاہتا تھا کہ اس حالت میں مجھ پر کیا عمل ہوتا ہے۔ مجھے اس بات کا بھی شوق

پڑھتے ہوئے بھی اندر گھس آئے ۔ یہ ممانعت قطعی کی وجہ ہی تھی ۔ کہ درد سے ٹیس اُٹھ اُٹھ کر مجھے لرزہ بر اندام کر رہی تھی ——

بھلا ایک کتا اپنی گلی میں دوسرے کتے کو نہیں آنے دیتا، تو میرے قابلِ پرستش بزرگوں اور معرکتہ الآرا کام کرنے والی آئندہ نسلوں کی عظیم الشان ہستیاں اس خارجی چیز کی مداخلت بے جا کو کب برداشت کر سکتی تھیں ۔ اُف درد! ماسوا اس چیز کے —— اس ذرے کے جو کہ ہماری آئندہ نسلوں کا اپنی ضرب و تقسیم کے ساتھ روحانی اور جسمانی بت ہے، یا ہمارے بزرگوں سے ہمیں ورثہ میں آئے ۔ کسی اور چیز کو مطلق دخل نہیں ۔ مادہ اور روح دونوں اس وقت تک چین نہیں پاتے جب تک کہ خارجی مادے کو ہر ایک تکلیف سہ کر جسم سے باہر نہیں پھینک دیا جاتا ۔

وہ ذرہ تو ہر جنبش سے اثر پذیر ہوتا ہے ۔ اگر آپ نے غلط روی سے اپنے جسم و روح کے نامناسب استعمال سے انہیں کسی طرح مفلوک اور ناتواں بنا دیا ہے ۔ تو آپکے وہ ذرے جنہوں نے آپکے بیٹے اور پوتے بننا ہے، مفلوک اور ناتواں حالت میں آپکے سامنے آکر آپکے دلی اور ذہنی اضطراب کا باعث ہونگے وہ اسے قسمت و تقدیر کہیں گے ۔ لیکن اگر قسمت کی تعریف مجھ سے پوچھیں ۔ تو وہ یہ ہے "صحبت نیک و بد

کے اثر کے علاوہ جو چیز پوری ذمہ داری سے ہمارے بزرگوں نے ہمیں دی ہے۔ وہ ہماری قسمت ہے۔" اس لیئے آپ جو بھی فعل کریں۔ سوچ کر کریں۔ انگلی بھی ہلائیں تو سوچ کر . . . . . یاد رکھیئے۔ یہ ایک معمولی بات نہیں ہے . . . . . اب شائد آپ ذرے کے قول و فعل سے کچھ واقف ہوگئے ہونگے۔

(۳)

اُس دن جس دن کہ سٹے کا بال میرے ناخن میں داخل ہوا۔ میں بہت مضطرب رہا —— شام کو میں گھبرائے ہوئے پاس ہی کے ایک شہر کے کسی بڑے اختر شناس کے پاس گیا۔ اُس نے میری راس وغیرہ دیکھتے ہوئے قیافہ لگایا۔ اور مجھے کہا۔ کہ برہسپت کا اثر تمہیں ہر بلا سے محفوظ رکھے گا۔ اور تمہاری عمر بہت لمبی ہے۔ اس کا شاید خیال ہو، کہ درازیٔ عمر کی پیشین گوئی سنکر یہ مالدار زمیندار اپنے بائیں ہاتھ میں چمکتی طلائی انگوٹھی اتار کر دے دیگا۔ مگر یہ بات سُنکر مجھے سخت بے چینی ہوئی۔ ایک مایوسی کے عالم میں میں نے اُسے اس کی قلیل فیس —— ایک ناریل، آٹا، اور پانچ پیسے دیدیئے . . . . . میں تو مرنا چاہتا تھا اور دیکھنا چاہتا تھا کہ اس حالت میں مجھ پر کیا عمل ہوتا ہے۔ مجھے اس بات کا بھی شوق

تھا، کہ میں اس راز کو، جس کی بابت بڑے بڑے حکیم اور ریاضی طبعیات کے ماہر کہہ چکے ہیں ——— "وہ کرتا ہے کچھ . . . . . . ہم نہیں جانتے کیسے . . . . " طشت از بام کر دوں، اور دنیا میں پہلا شخص بنوں جو کہ دوسری ہیئت میں آتے ہوئے اپنی حیرت انگیز یادداشت کے ذریعہ سے دُنیا پر واضح کر دے۔ کہ ذرّے کو یہ حالت پیش آتی ہے ——— اور وہ اس شکل میں تبدیل ہوتا ہے۔

اس بات کے مشاہدہ کے لئے خود مرنا لازمی تھا، مگر عاقل اختر شناس نے اس کے برعکس درازیٔ عمر کی روح فرسا خبر سُنائی تھی، آتم گھات، خودکشی ایک پاپ تھا، جس کا ارتکاب نہ صرف میرے بزرگوں کے نام پر دھبہ لگاتا تھا، بلکہ موجودہ بچوں اور آئندہ نسلوں پر بھی اثر انداز ہوتا تھا، چنانچہ میں نے خودکشی کے خیال کو بالکل باطل گردانا۔

میں جنگل میں ایک ٹیلے پر بیٹھا تھا، وہاں سے دریائے گنڈک کے ایک معاون کے . . . . . آبشار کی آواز صاف طور پر کانوں میں آرہی تھی۔ اور چونکہ مجھے وہی بات خوش کر سکتی تھی۔ جو کہ میرے دل کو مضطرب کرے۔ اس لئے گنڈک کے معاون کے آبشار کی دل کو بٹھا دینے والی آواز مجھے بھا رہی تھی، ایک پتھر کو الٹاتے ہوئے میں نے بہت سے کیڑے مکوڑے دیکھے۔ پھر میں نے کہا:۔

"شاید اس آبشار کی آواز اور موت کے راگ میں کچھ مشابہت ہو ــــــ" شام ہو چکی تھی، سورج مکمل طور پر ڈوبا بھی نہیں تھا، کہ سر پہ چاند کا بے نور اور کاغذی رنگ کا جسم دکھائی دینے لگا پتھروں میں سے ایک جلا دینے والی بھڑاس نکل رہی تھی۔ یکایک مجھے ایک خیال آیا ایک ترکیب سوجھی جس سے کہ میں ذرے کی ہیئت بدلنے کا مشاہدہ کر سکتا تھا، یعنی موت کا عمل بھانپ سکتا تھا، اُسے ہم خودکشی بھی نہیں کہہ سکتے۔ وہ صرف مشاہدہ کی آخری منزل ہے۔ وہ یہ ــــ کہ گنڈک کے معاون کے آبشار سے آدھ میل بہاؤ کی طرف جہاں پانی کی خوفناک لہریں ایک پتھریلے ٹیلے کو عموداً ٹکرا کر اپنا دم کھوتے ہوئے جنوب مشرق کی طرف گنڈک سے ملنے کے لئے بہ نکلتی ہیں۔ نہانے کے لئے اتر جاؤں، اور غیر ارادی طور پر پانی کے اندر رہی اندر گہرائی اور تیز بہاؤ کی طرف آہستہ آہستہ چلتا جاؤں۔ اور یہ صورت پیدا ہو، کہ یا میرا پاؤں کسی آبی جھاڑی میں اڑ جائے۔ یا کوئی جانور مجھے کھینچ لے، یا پانی کا کوئی زبردست ریلا وہ عمل میرے سامنے لے آئے۔ جس سے ذرہ کو کوئی دوسری صورت ملے ــــــــــ شاید آپ اسے بھی خودکشی کہیں مگر اس غیر ارادی فعل کو میں تو قدرتی موت کہوں گا۔

چنانچہ مرنے سے بہت پہلے میں نے اپنے تصوّر میں گنکھل ــــ

گنگا مائی کے چرنوں پر سر رکھا۔ اور سوگند لی۔ کہ میں ضرور اس غیر ارادی فعل کو پایۂ تکمیل تک پہنچاؤں گا۔

(۴)

گنڈگ کا معادن آبشار سے ایک میل بہاؤ کی طرف بھی اس تیز رفتاری سے بہ رہا تھا۔ باوجودیکہ عموداً چٹان سے ٹکراتے ہوئے اس کی لہریں اپنا دم کھو چکی تھیں۔

میں کمر تک مکتی ناتھ اور دھولا گری کے ارد گرد کی پہاڑیوں سے آئے ہوئے برفانی پانی میں داخل ہو چکا تھا۔ میں جلدی جلدی آگے بڑھنا نہ چاہتا تھا۔ کیونکہ ایسا کرنا اراد تاً اپنے آپ کو مار ڈالنا تھا کچھ آگے بڑھتے ہوئے میں نے آہستہ آہستہ پاؤں کو اقلیدسی نصف دائرہ کی شکل میں گھومانا شروع کیا، اور پانچ منٹ کے قریب ایسا کرتا رہا تاکہ کوئی پانی کا ریلا مجھے بہالے جائے۔ یا کوئی نیند وا یا گھڑیال پانی میں ٹانگ پکڑ کر مجھے گھسیٹ لے۔ مگر ایسا نہ ہوا۔

. . . . معاً میرا پاؤں ایک آبی جھاڑی میں الجھ گیا۔ اور میں پانی میں غوطے کھانے لگا میرا پاؤں پھسلا، اور دوسرے لمحہ میں میں پانی کے تموّج میں تھا۔ پانی کے ریلے بڑے زور شور سے میرے سر پر

سے گزر رہے تھے۔

کچھ دیر تک تو میں نے اپنا دم سادھے رکھا۔ مگر کب تک؟ ....

بے ہوش ہونے سے پہلے مجھے چند ایک باتیں یاد تھیں۔ کہ میری ٹانگیں اور ہاتھ تیز پانی میں کانپتے ہوئے اِدھر اُدھر چل رہے تھے۔ باہر نکلتے ہوئے سانس سے چند بلبلے اُٹھ کر سطح کی طرف گئے۔ میرے دماغ میں زندہ رہنے کی ایک زبردست خواہش نے اکساہٹ پیدا کی۔ اور کوشش میں میں کسی چیز کو پکڑنے کے لئے پانی میں اِدھر اُدھر ہاتھ پاؤں مارنے لگا، مگر اب میں پانی کی زد سے باہر نہ آسکتا تھا۔ باوجودیکہ میں نے بہت کچھ جدوجہد کی۔

اسکے بعد میری یادداشت مختل ہونے لگی ... میرے بزرگان ... کنکھل ..... پرانی حکایتوں کا شہزادہ .... موت کا راز ... مکتی ناتھ ..... کنکھل .... موت کا راز .... اس کے بعد ایک نیلا سا اندھیرا چھا گیا۔ اندھیرے میں کبھی کبھی روشنی کی ایک جھلک ایک بڑے سے کیڑے کی شکل میں دکھائی دیتی ... پھر پُرانی حکایتوں کا شہزادہ ...... ذرہ ...... موت کا عمل .... خاموشی اور اندھیرا ہی اندھیرا!!

اس مکمل بے ہوشی میں مجھے ایک نقطہ سا دکھائی دیا۔ جو کہ برابر

پھیلتا گیا۔ شاید یہ وہی ذرہ عظیم تھا۔ جس کی بابت میں نے بہت کچھ کہا ہے۔ جو کہ بسیط ہوتا گیا۔ وہ پھیل کر ایک جھلّی کی سی صورت میں میرے جسم کے اردگرد لپیٹ گیا۔ اس طرح کہ اب پانی اس میں داخل نہیں ہو سکتا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہوا، جیسے میں کسی خلا میں ہوں۔ جہاں سانس لینا بھی ایک تکلف ہے۔

ذرّہ عظیم سے آواز آنے لگی:۔

موت کے عمل میں تین حالتیں ہوتی ہیں۔ قبل از موت۔ موت۔ بعد از موت۔ اول حالت میں ہو سکتا ہے۔ کہ دوسری حالت تم پہ طاری ہونے سے پہلے تم زندہ رہ جاؤ۔ قدرتاً اس میں تمہیں دوسری حالت کا احساس نہیں ہو سکتا۔ دوسری حالت میں تم اس بات کو ایک عارضی عرصہ کے لئے جان سکتے ہو۔ جس کی تم اتنی خواہش لئے ہوئے ہو مگر اس کا اظہار نہیں کر سکتے۔ مابعد موت تمہیں زندگی کی پہلی نشانی گویائی کی قوت عطا کی جاتی ہے۔ پھر یادداشت کو جو اول دوم حالت میں تمہارے ساتھ ہوتی ہے۔ اسے خیر باد کہنا ہوتا ہے۔ ذرے کو فراموشی عطا کر کے اس پر مہربانی کی جاتی ہے۔ عین اسی طرح جیسے آدمی کو غیب سے ناآشنا رکھ کر اس پر کرم کیا جاتا ہے ـــ وہ راز یادداشت کی مکمل تحلیل میں پنہاں ہے۔

"یادداشت کی مکمل تحلیل۔" میں نے ان الفاظ کو ذہن میں دہراتے ہوئے کہا۔ "یادداشت کی تحلیل — کیا ہماری نسلیں بھی ہماری یادداشت ہیں؟ ۔۔۔۔ اور کیا اس کی مکمل تحلیل پر میں وہ راز دنیا والوں کے سامنے طشت از بام کر سکتا ہوں؟ ۔۔۔۔۔۔ میں زندہ رہنا چاہتا ہوں۔"

— زندگی کی اس خواہش کے ساتھ ہی میں نے اپنے آپ کو مکتی ناتھ اور دھولا گری کے ارد گرد کی پہاڑیوں میں سے بہ کر آتے ہوئے برفانی پانی کی سطح پر پایا۔ جھلی سی میرے جسم پر سے اتر چکی تھی؛ زندگی کی ایک اور خواہش کے پیدا ہوتے ہی گنڈک کے معاون کے ایک ریلے نے مجھے کنارے پر پھینک دیا۔ اس وقت چاندنی رات میں ہوا تیزی سے چل کر سانس کی صورت میں میرے ایک ایک مسام میں داخل ہو رہی تھی ⁂

کتبہٗ محمد شریف عباسی کاتب لاہور